ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی سوانح عمری

اپنا گریباں چاک

(تحقیقی وتوضیحی جائزہ)

مقالہ برائے ایم فل اقبالیات

Acc. 113169
Date 29-08-09

مقالہ نگار

ثمینہ یاسمین

رول نمبر۔ L-7182305

رجسٹریشن نمبر-97-PRN-0955

نگران

ڈاکٹر ریاض مجید

شعبہ اردو

پشاور یونیورسٹی پشاور

شعبہ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ۲۰۰۸ء

بسم الله الرحمن الرحيم

ترتیب

باب اول: پس منظر ۱۲

۱۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال: مختصر احوال

۲۔ اردو میں سوانح نگاری کی روایت، مختصر جائزہ

۳۔ ''اپنا گریباں چاک'' کا اشاعتی تعارفی مطالعہ

ا۔ کتاب کی اشاعت

ب۔ کتاب کا آغاز، پیش لفظ

(اظہار تشکر پر تبصرہ، درج اشعار کی علامتی و اشاراتی توضیح)

ج۔ کتاب کے ابواب کی تقسیم

باب دوم: جاوید اقبال کی ابتدائی زندگی کا تحقیقی و توضیحی تجزیہ ۵۴

''اپنا گریباں چاک'' کے پہلے چار درج ذیل ابواب

۱۔ جنم پتری

۲۔ چند ابتدائی سال

۳۔ جاوید منزل

۴۔ اپنے آپ کی تلاش کا تحقیقی و توضیحی تجزیہ

باب سوم: تعلیمی و عملی زندگی ۷۹

''اپنا گریباں چاک'' کے درجِ ذیل ابواب کے حوالے سے جاوید اقبال کی فہم حیات کا تجزیہ

۱۔ انگلستان

۲۔ پاؤں میں چکر

۳۔ خانہ آبادی

۴۔ عدل گستری

۵۔ نظریہ سے انحراف

۶۔ عدالت عظمیٰ کے تین برس

۷۔ مستقبل کی تعمیر

۸۔ سفر جاری ہے

کے حوالے سے جاوید اقبال کی فہمِ حیات کا تجزیہ

باب چہارم: ''اپنا گریباں چاک'' میں فکر اقبال پر جاوید اقبال کے تبصروں کا تجزیہ ۱۰۵

باب پنجم: (ا) ''دوسرا خط'' کا توضیحی جائزہ ۱۲۲

دوسرے خط کے حوالے سے فکر اقبال کے درج ذیل پہلوؤں کا جائزہ:

۱۔ اقبال کا تصوّر اسلامی ریاست

۲۔ اقبال کا تصوّر قومیت اور ملت

(مولانا حسین احمد مدنی سے اختلاف کی حدود اور وجوہ سے متعلق مباحث، جاوید اقبال کا مولانا حسین احمد مدنی کی طرف جھکاؤ، جغرافیائی حدود سے بیزاری اور علیحدہ وطن کا مطالبہ)

۳۔ دوقومی نظریہ

۴۔ جداگانہ اور مخلوط انتخاب

۵۔ آئینی و دستوری تصوّرِ خلافت اور جمال الدین افغانی

۶۔ اقبال کا تصوّرِ توحید

۷۔ اقبال کا روحانی جمہوریت کا تصور

۸۔ اقبال کی تعبیرِ دین (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، معنی و مفہوم اور حدود و ثقود کا مطالبہ)

۹۔ آزادانہ قانون سازی کے وسیع اختیارات کی حامل پارلیمان کا تصوّر، تصوّر اجتہاد اور اس کی اہمیت

۱۰۔ اقبال کا تصوّرِ معیشت

۱۱۔ اقبال کا تصوّرِ مردِ حق

(ب) ''خود کلامی'' کا توضیحی جائزہ

باب ششم: اقبال اور جاوید اقبال محسوس اور غیر محسوس ذہنی کشمکش کا تجزیہ ۱۴۱

باب ہفتم: خلاصہ مباحث، اہل قلم کا ردعمل واسلوب ۱۵۷

(ا) خلاصہ مباحث

(ب) اہل قلم کا ردعمل (ترجمہ تبصروں اور اور تقاریب کے حوالے سے)

(ج) اسلوب

کتابیات: ۲۰۹

ضمیمہ: ۲۱۴

(الف) خطوط

مکتوب جاوید اقبال بنام ڈاکٹر انور محمود خالد

تبصرہ ڈاکٹر انور محمود خالد بحوالہ ''اپنا گریباں چاک''، مشفق خواجہ

مکتوب مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر انور محمود خالد بحوالہ ''اپنا گریباں چاک''

(ب) انٹرویو ۲۳۳

(ج) تصاویر ۲۶۰

☆☆☆

حرفِ آغاز

''اپنا گریباں چاک'' کے حوالے سے یہ مقالہ ایک توضیحی مطالعے پر مشتمل ہے جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبۂ اقبالیات کی ایم فل کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ مطالعہ اس حوالے سے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ شاعرِ مشرق اور اردو و فارسی کے ایک عظیم شاعر علامہ اقبال کے فرزند کی سوانح عمری سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال دوست جاوید اقبال کی تحریروں کو عقیدت کے علاوہ اس لیے بھی پڑھتے ہیں کہ ان میں علامہ اقبال کے بارے میں کسی نہ کسی ایسی بات کا سراغ ملتا ہے جس سے علامہ اقبال کے فکر وفن اور زندگی کے بعض گوشوں پر جاوید اقبال کی اقبال شناسی کے حوالے سے روشنی پڑتی ہے۔

جاوید اقبال نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں خالصتاً علامہ اقبال کے فکر وفن سے متعلق ہیں۔ کچھ ان کی تخلیقی اور تنقیدی تحریروں کے مجموعے ہیں۔ یہ کتاب ان کی سوانح عمری ہے جس کے مندرجات کا ہم آئندہ صفحات میں جائزہ لیں گے، یہ کتاب اس حوالے سے اہم ہے کہ اس میں ایک عظیم شاعر کے بیٹے کی ذہنی ساخت اور عمر کے مختلف حصوں میں ان کے رجحانات اور افتادِ طبع کے اتار چڑھاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ خالصتاً ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ آیا عظیم لوگوں کی اولاد بھی عظیم ہوتی ہے یا نہیں؟ جاوید اقبال کے لیے ان کا فرزندِ اقبال ہونا ہمیشہ ایک مسئلہ رہا جو ایک حوالے سے ان کی ذہنی نشوونما میں بھی ایک رکاوٹ یا حجاب بنا رہا۔ ہمارے معاشرے میں خصوصاً قاری کی پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچے کو باپ کے حوالے سے دیکھے جبکہ ایسا ممکن نہیں۔

جاوید اقبال اس اعتبار سے بڑے معصوم اور مظلوم ہیں کہ ان کا ہر ناقد انھیں اقبال ہی کے حوالے سے جاننا چاہتا ہے۔۔۔ اور اس حوالے سے جاوید اقبال ''شرارتی'' اور ''ظالم'' ہیں کہ وہ اپنی تحریروں کے بین السطور اقبال کے حوالوں سے گریز پا ہونے کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی حیثیت میں کسی حوالے سے اقبال یا اقبال کے اثرات کو شامل کرنا زیادہ بہتر خیال نہیں کرتے اور اپنے آپ کو اپنی ہی ذات کے حوالے سے تسلیم کرانے پر مصر رہتے ہیں۔

اس مقالے میں جاوید اقبال کو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ اقبال کے سائے سے جدا ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہیں اور اقبال کے سائے میں تو بہت کچھ ہیں ہی۔

یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کی تقسیم درج ذیل ہے:

پہلا باب: ''اپنا گریباں چاک'' کے حوالے سے بعض تمہیدی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کے مختصر احوال، اردو میں سوانح نگاری کی روایت کا مختصر جائزہ۔ ''اپنا گریباں چاک'' کا ابتدائی تعارفی مطالعہ یعنی کتاب کی اشاعت، کتاب کا آغاز، پیش لفظ، اظہارِ تشکر پر تبصرہ، آغاز پر درج اشعار کی علامتی و اشاراتی توضیح اور کتاب کے ابواب کی تقسیم کا بیان ہے۔

دوسرا باب: جاوید اقبال کی ابتدائی زندگی کے تحقیقی و توضیحی مطالعہ پر مشتمل ہے، اس کے حصول میں ''اپنا گریباں چاک'' کے پہلے چار ابواب بہ عنوان جنم پتری، چند ابتدائی سال، جاوید منزل اور اپنے آپ کی تلاش کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب: جاوید اقبال کی تعلیمی و عملی زندگی کے حوالے سے ہے۔ اس میں ''اپنا گریباں چاک'' کے ابواب ۵ تا ۱۲ بعنوان انگلستان، پاؤں میں چکر، خانہ آبادی، عدل گستری، نظریہ سے انحراف، عدالت عظمیٰ کے تین برس، مستقبل کی تعمیر، سفر جاری ہے، کے حوالے سے جاوید اقبال کی زندگی کا تجزیہ ہے۔

چوتھا باب: ''اپنا گریباں چاک'' کے میں فکرِ اقبال پر جاوید اقبال کی آرا سے متعلق ہے۔ جاوید اقبال نے علامہ اقبال کے افکار پر کئی جگہ کھل کر تبصرہ کیا ہے۔ اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ علامہ اقبال کے افکار و خیالات پر جاوید کے تبصرے کا جائزہ لیا جائے۔

پانچواں باب: ''دوسرا خط'' کا توضیحی جائزہ ہے۔ اس خط میں جاوید اقبال نے علامہ اقبال کے کئی تصورات (تصورِ ملّت، تصورِ قومیت، دوقومی نظریہ، جداگانہ اور مخلوط انتخاب، آئینی و دستوری،

تصوّرِ خلافت اور جمال الدین افغانی ،اقبال کا تصورِ توحید ،اقبال کا روحانی جمہوریت کا تصّور،اقبال کی تعبیر دین ،آزادانہ قانون سازی کے وسیع اختیارات کے حامل پارلیمان کا تصّور،اقبال کا تصّور معیشت،اقبال کا تصورِ مردِ حق) پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اسی باب میں جاوید اقبال کے دوسرے خط اور خود کلامی کے مندرجات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چھٹا باب: اقبال اور جاوید اقبال کی محسوس اور غیر محسوس ذہنی کشمکش کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔اپنا گریبان چاک کے مجموعی مطالعے سے باپ اور بیٹے میں ایک محسوس اور غیر محسوس ذہنی کشمکش کا سراغ ملتا ہے۔یہ کشمکش محبت اور گریز دونوں سے عبارت ہے۔اس باب میں پوری کتاب کے حوالے سے اس کیفیت اور کشمکش کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ساتواں باب: مقالے کا آخری باب بحیثیت مجموعی کتاب کے مطالعے سے برآمد ہونے والے نتائج ہیں۔اس باب میں جاوید اقبال کی سوانح عمری کے مضامین، واقعات اور اسلوب کے حوالے سے اہلِ قلم کا ردِعمل ''اپنا گریباں چاک'' کے حوالے سے بعض اخباری تبصرے اور مضامین کا بیان ہے۔ نیز مصنف کے اسلوب تحریر کے حوالے سے ان کے ادبی مقام و مرتبے کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کے آخر میں ضروری کتابیات کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے اس مقالے کی ترتیب و تدوین سے استفادہ کیا گیا ہے۔مقالے کے آخر میں ضمیمہ ہے ضمیمہ کے مندرجات اگرچہ باقاعدہ طور پر مقالہ کا حصہ نہیں ہوتے بلکہ یہ اور مقالے سے متعلق ذیلی اور ضمنی معلومات ہوتی ہیں جن سے قارئین بوقت ضرورت استفادہ کر سکتے ہیں۔

ضمیمہ میں بعض دلچسپ خطوط کو من وعن مقالے کے آخر میں دے دیا گیا ہے۔نیز جاوید اقبال کے ساتھ ایک انٹرویو کو شامل کیا گیا ہے جو زیر جائزہ کتاب کے مندرجات کے حوالے سے ہے جاوید اقبال کی سوانح عمری اس اعتبار سے ہمیشہ اضافہ طلب رہے گی کہ ان کے اپنے خیالات (علامہ اقبال کے افکار کے حوالے سے) نہ صرف نت نئے راستے اختیار کرتے رہیں گے بلکہ

ان کی تشریح اور تفسیر میں بھی تبدیلی ہوتی رہے گی چونکہ جاوید اقبال کے دائرہ حیات میں علامہ اقبال کا حوالہ ایک مرکزی حوالہ رہے گا۔اس لئے وقت کے ساتھ ساتھ ان میں اضافے اور تبدیلی کی ہمیشہ گنجائش رہے گی۔

''اپنا گریباں چاک''اس حوالے سے ادبی حلقوں میں زیر بحث بھی آتی رہے گی اور جاوید اقبال کے موقف اور نظریات وافکار بھی ہمیشہ ایک تحرّک سے دوچار رہیں گے۔ مجھے اس کا کبھی اندازہ نہ ہوتا اگر میں کتاب کے حوالے سے اُن کا تفصیل انٹرویو نہ لیتی۔ انٹرویو میں پتہ چلا کہ انہوں نے اس کتاب کے حوالے سے کچھ نئے باب بھی لکھے ہیں۔ جو اُن کی دوسری کتابوں میں چھپ رہے ہیں اور علامہ اقبال کے افکار پر بھی ان کی رائے میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ خصوصاً جب وہ علامہ اقبال کے حوالے سے بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمینارز میں جاتے ہیں تو نت نئے خیالات اور مسائل ان کے سامنے آتے ہیں۔انٹرویو کے مطالعہ سے ان کی اس بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اسی لئے انٹرویو کو مقالے کے آخر میں جداگانہ طور پر شامل ضمیمہ کر دیا گیا ہے کہ جاوید اقبال کے افکار کا مطالعہ کرنے والے اس انٹریو سے اپنے اپنے طور پر استفادہ کر سکیں۔

جاوید اقبال کے انٹرویو سے مجھے بہت سی تازہ معلومات ملیں اور میری واقفیت میں اضافہ بھی ہوا۔بعض خیالات وافکار کی گتھیاں جاوید اقبال صاحب سے گفتگو میں کھلیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی سوانح عمری ان کی زندگی بھر کا ایک مستقل کام اور ہمہ وقتی سوچ بچار کے سبب ہمیشہ پھیلنے والی ادبی مصروفیت ہے۔

اس مقالے میں موضوع کے انتخاب سے لے کر اس کی تکمیل تک جن اساتذہ نے میری رہنمائی کی ان میں ڈاکٹر نثار احمد قریشی مرحوم، ڈاکٹر شاہد اقبال کامران اور نگرانِ مقالہ ڈاکٹر ریاض مجید کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔طاہرہ بہن اور بھائی شاہد فاروق اور عامر منیر اور عزیزی نوید سیالوی کی

تاکید وتوجہ اور والدین کی پرخلوص دعاؤں کا قرض ہمیشہ میری گردن پر رہے گا۔ مَیں اپنے رفیقِ حیات کی بھی بہت ممنون ہوں جنھوں نے ہر مقام پر میری حوصلہ افزائی کی اور مقالے کی تکمیل کو میرے لیے ممکن بنایا۔

''اپنا گریباں چاک'' کے تحقیقی وتوضیحی مطالعے کے حوالے سے یہ مقالہ میری ایک طالب علمانہ کاوش ہے۔ امید ہے کہ اس مطالعہ سے جہاں ایک طرف جاوید اقبال اور علامہ اقبال کی زندگی کے اہم ادوار کی تفہیم میں مدد ملے گی وہاں جاوید اقبال کی اقبال فہمی کے انداز کا کچھ تجزیہ بھی سامنے آسکے گا۔

ثمینہ یاسمین

☆☆☆

باب اول: پس منظر

الف۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، مختصر احوال

ب۔ اردو میں سوانح نگاری کی روایت

ج۔ ''اپنا گریباں چاک'' کا تعارفی مطالعہ

(الف)

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، مختصر احوال

جاوید اقبال ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے چند سال قبل علامہ اقبال نے مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی کہ اللہ انہیں بیٹا عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اقبال کی دعا قبول کی۔ جب جاوید اقبال ہوش مند ہوئے تو اقبال انہیں لے کر مجدد الف ثانی کے مزار پر پہنچے اور فاتحہ خوانی کی۔

> ''جاوید اقبال کی پیدائش کے بعد ان کے دادا شیخ نور محمد نے ان کے کان میں اذان دی اور بڑے پوتے آفتاب کی نسبت سے جاوید کا نام قمر الاسلام تجویز کیا لیکن اقبال اس نام پر متفق نہ ہو سکے اور اپنے پہلے سے سوچے ہوئے نام جاوید کو ترجیح دی۔ یہ نام اقبال کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ثابت ہوا۔ جاوید نامہ اور جاوید سے منسوب اقبال کی نظموں کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔''(۱)

اقبال کو اپنے بچوں جاوید اقبال اور منیرہ سے بہت پیار تھا۔ ان بچوں کے ہوش سنبھالتے ہی اقبال کو بیماریوں نے آلیا۔ جاوید اقبال کی عمر تقریباً دس برس تھی جب ان کی والدہ سردار بیگم کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اقبال کی بچوں سے محبت میں اور شدت آ گئی۔ بظاہر اقبال کم گو اور سرد مہر دکھائی دیتے تھے لیکن اپنی اولاد کے لئے محبت کا ایک طوفان دل میں چھپائے ہوئے تھے جو سردار بیگم کی وفات کے بعد ظاہر ہوا۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب کو جاوید میاں سے جس قدر محبت تھی اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں۔ جو ان کی خدمت میں روز حاضر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب طبعاً بڑے خاموش اور سنجید بزرگ تھے۔ لیکن جب کبھی وہ جاوید کو آواز دے کر بلاتے، اسے کھیلتے ہوئے

دیکھتے یا احباب کا ذکر کرتے تو پدرانہ شفقت ان کے دل کو گداز کر دیتی اور ان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں، کبھی کبھی رخساروں پر آنسو بہنے لگتے، پیشانی پر زاویے ابھرتے اور مٹ جاتے۔(۲)

جاوید اقبال اپنے مکان کی چھت پر پتنگ اڑا رہے ہوتے تو اقبال دبے پاؤں اوپر جاتے اور جاوید سے پتنگ لے کر خود اڑانے لگتے۔ جاوید اقبال کرکٹ کھیل رہے ہوتے تو علامہ اقبال بھی شریک ہو جاتے۔ ان چھوٹے چھوٹے واقعات سے علامہ کے محبت بھرے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''گرمیوں کی ایک شام راقم آنکھوں پر دوپٹہ باندھے (سردار بیگم) اپنی والدہ کو پکڑنے کے لئے زنانہ دالان میں ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر لگی اور منہ کے بل گر پڑا جس کے باعث نچلا ہونٹ اندر سے کٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ اتفاق سے عین اسی لمحے اقبال زنان خانے میں داخل ہوئے اور راقم کے منہ سے خون بہتے دیکھ کر اچانک بے ہوش ہو گئے۔''(۳)

جاوید اقبال کو اپنے گھر میں جو ماحول میسر آیا اس میں نہ تو گھٹن تھی اور نہ ہی حد سے زیادہ آزادی۔ جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' میں اس حوالے سے تفصیلی بحث کی ہے اور ''اپنا گریباں چاک'' میں بھی اکثر مقامات پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ جاوید اقبال میں وہ تمام جوہر موجود تھے جو ایک ذہین اور لاڈلے بچے میں ہوا کرتے ہیں۔ وہ کھیل کود میں بھرپور دلچسپی لیتے تھے، شرارتیں کرتے تھے، کبھی کبھار چوری چھپے کوئی فلم بھی دیکھ لیتے تھے۔ ایک بار مٹھائی بیچنے والے سے ٹیبل فین کے پیچھے لگے ہوئے پیتل کے بدلے میں مٹھائی خرید کر کھائی اور علامہ اقبال کے ہاتھوں پٹے بھی! ان سب باتوں کے باوجود انہیں اقبال کی طرف سے ملنے والا علم، دوستی، خودداری اور حق شناسی کا سبق بخوبی یاد تھا۔

جاوید اقبال کو بچپن میں کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ساتویں جماعت کا امتحان سر پر آیا تو ان کی توجہ الف لیلہ نے کھینچ لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جاوید اقبال ساتویں جماعت میں فیل ہو گئے۔ اس موقع پر اقبال نے ان کی نفسیاتی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا:

''اگر تم امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد الف لیلہ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا۔'' (۴)

اقبال اپنے بیٹے میں درویشی کی صفات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ جاوید اقبال کو لباس کے معاملے میں سادگی کا حکم دیتے۔ انہیں مغربی لباس اور تہذیب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''مجھے انگریزی لباس پہننے کی اجازت نہ تھی۔ ان کے یہ احکام تھے کہ میں نے شلوار قمیض پہننی ہے اور کپڑا بھی قیمتی نہیں خریدنا۔ جوتے جو خریدنے ہیں ان کی قیمت آٹھ روپے سے زیادہ نہ ہو۔ خرچ کرنے کے لئے مجھے ایک آنہ ملا کرتا۔ اگر انہیں پتا چلتا کہ میں فلاں رات چارپائی کی بجائے زمین پر سویا ہوں تو خوش ہوتے تھے۔'' (۵)

اس تربیت نے جاوید اقبال کے مزاج پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ انگلستان میں ایک طویل عرصے تک رہے، مغربی لباس بھی پہنا لیکن ان کا ذہن پاکستانی ہی رہا۔ انہیں اچکن اور شلوار پہننے میں خوشی محسوس ہوتی۔ بچپن میں عید کے موقع پر وہ کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے پہنتے اور علامہ اقبال کی انگلی پکڑ کر شاہی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے۔ ان کے ذہن میں اپنے بچپن کی اچکن تلے والی ٹوپی اور افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ کی طرف سے تحفے کے طور پر ملنے والی گھڑی کی یاد اب تک محفوظ ہے۔

انگلستان میں جاوید اقبال نے بت تراشی بھی سیکھی، تصویریں بھی بنائیں اور انگریز دوستوں سے رابطے بھی قائم کئے، لیکن بقول ان کے پاکستان واپسی کے ساتھ ہی یورپی تمدن کا سارا اثر ایک لمحے میں ختم ہو گیا۔

جاوید اقبال نے پرائمری تک سیکرڈ ہارٹ مشنری ہائی سکول لاہور اور سینٹ فرانسس سکول لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ایک سال اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں بھی زیر تعلیم رہے۔ میٹرک سنٹرل ماڈل ہائی سکول سے کیا۔ وہ سکول کے ذہین طلبہ میں شمار ہوتے تھے شیکسپیئر کے ڈراموں میں دلچسپی اسی زمانے میں پیدا ہوئی۔ جاوید اقبال نے جولیس سیزر کے کردار انتھونی کی مشہور زمانہ تقریر سنا کے انعام بھی حاصل کیا۔ ۱۹۴۰ء میں جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو ڈرامے لکھ کر اور جی سی ڈی سی کے ممبر بن کر اپنے ذوق کی تسکین کی، تاہم تعلیم کے حصول میں کوئی کوتاہی نہ برتی۔ انہوں نے دو ایم اے

کیے۔ پہلا ایم اے انگریزی زبان وادب میں اور دوسرا فلسفے میں! جاوید اقبال نے فلسفے میں گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد پہلے دو برسوں میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے افسانے اور ڈرامے ترقی پسند رسالوں میں شائع ہوئے اور اپنی انفرادیت کے سبب نمایاں بھی ہوئے۔ جاوید اقبال ہمیشہ اپنے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد رکھ کر آگے بڑھے، انہیں تقلید گوارا نہیں۔ فیشن اور جدت پسندی کے شوق میں وہ ایسے نظریات کو اپنانے کے حق میں ہرگز نہیں جو ان کے افکار سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

سکول کے زمانے میں جاوید اقبال کا رجحان سائنس کی طرف تھا۔ وہ سائنس کے مضامین میں زیادہ نمبر لیتے تھے۔ چنانچہ اقبال کی خواہش تھی کہ وہ جاوید کو ڈاکٹر بنائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا اور جاوید اقبال نے علامہ کی خواہش کو ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) بن کر پورا کیا۔ وہ غیر شعوری طور پر ادب اور فلسفے کے اسی رستے پر چلے جو ان کے والد نے منتخب کیا تھا۔ فلسفے اور انگریزی ادب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے والد کی طرح بار ایٹ لاء کی ڈگری بھی حاصل کی۔ انگریزی ادب کے مطالعے نے جاوید اقبال کے دل میں یونانی، اطالوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور المانوی ادب کے شہ پاروں کو پڑھنے کا شوق پیدا کیا اور انہوں نے یورپی کلاسیکی اور ماڈرن لٹریچر کا انگریزی تراجم کے ذریعے مطالعہ کیا۔

جاوید اقبال نے علامہ راشد الخیری اور عبدالحلیم شرر کے ناول پڑھے، رتن ناتھ سرشار کا ''فسانہ آزاد'' اور شبلی کی تصانیف پڑھیں اور آغا حشر کے ڈراموں کا ابتدائی عمر ہی میں مطالعہ کیا۔ اسی شوق کی وجہ سے انہوں نے فلسفے کا مضمون پسند کیا لیکن جب چودھری محمد حسین نے انہیں غالب پڑھایا۔ حالی اور اقبال کا مطالعہ کرایا تو جاوید اقبال نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ایک واضح مقصد کا تعین کر لیا اور مسلم سیاسی فلسفے کے مطالعے کو اپنی منزل قرار دیا۔

قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کے علاوہ جاوید اقبال کو اپنے بچپن میں جن عظیم اور اہم ہستیوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ان میں مولانا محمد علی جوہر، سروجنی نائیڈو، پنڈت جواہر لال نہرو اور سر راس مسعود قابل ذکر ہیں۔ جاوید اقبال کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر میں ماسٹر تارا چند اور ماسٹر غلام ناصر جیسے لوگ بھی شامل ہیں

جاوید اقبال ان کا ذکر بہت محبت سے کرتے ہیں۔

جاوید اقبال سنٹرل ماڈل سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے زمانے کی یادداشت کو کچھ اس انداز میں سمیٹتے ہیں:

''میرے ایک ہندو استاد تھے ماسٹر تارا چند۔ انہی سے میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی میری جو خوش خطی ہے۔ یہ بھی ماسٹر تارا چند کی وجہ سے تھی وہ بہت خوشخط تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر بید مار مار کر مجھے خوشخطی سکھائی۔ ان ہی ماسٹر تارا چند کی وجہ سے ابتدائی مراحل میں کامیابی حاصل کر کے میں سنٹرل ماڈل سکول میں آیا۔۔۔ سنٹرل ماڈل سکول میں ماسٹر غلام ناصر سے متاثر ہوا۔'' (۶)

گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے جاوید اقبال نے بہت محنت کی راوی میں لکھتے رہے، ڈرامیٹک کلب میں بھرپور حصہ لیا اور ادبی سرگرمیوں کا دائرہ کالج سے باہر بھی پھیلایا۔ ''ادب لطیف'' ''سویرا''، ''سنگ میل'' اور ''اردو ادب'' میں ان کے افسانے اور ڈرامے شائع ہوئے۔ ادبی حلقوں میں بطور ڈرامانگار ان کی شناخت ہوئی لیکن وہ خود گورنمنٹ کالج کے کسی استاد سے متاثر نہیں ہوئے، البتہ کالج کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے چودھری محمد حسین سے بھرپور استفادہ کیا۔ اپنے والد کے بعد حصول علم کے سلسلے میں اگر جاوید اقبال کسی سے متاثر ہوئے تو وہ چودھری محمد حسین تھے۔

جاوید اقبال ان تمام شخصیات سے نظریاتی طور پر متاثر ہوئے جو انقلاب کی داعی ہیں۔ ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ نے ان کی رہنمائی کی، البیرونی اور شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) نے مسلم قومیت کا تصور اجاگر کیا، شاہ ولی اللہ، سید امداد ہلوی شاہ اسماعیل شہید اور سر سید احمد خان کے افکار کو انہوں نے دل سے قبول کیا، جمال الدین افغانی اور شبلی نعمانی کے انقلابی تصورات سے اخذ و استفادہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے فکر کو سمجھا اور یہ اندازہ بھی لگایا کہ علامہ اقبال کے کلام میں تمام مسلم انقلابی مفکرین کے تصورات موجود ہیں۔

انگلستان میں قیام کے دوران میں جاوید اقبال نے ''مسلم سیاسی فلسفے کا ارتقاء'' برّصغیر پاک و ہند کے حوالے کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل اور اس کے ساتھ ہی بار ایٹ لاء کیا۔ اس کے بعد وہ وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے اور پھر جسٹس اور چیف جسٹس کے عہدوں پر فائز ہوئے مسلم سیاسی فلسفے کی تحقیق سے وہ اس

قابل ہوئے کہ علم کے دروازے پر دستک دے سکیں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ان کے علمی اور فکری مقالات شائع ہونا شروع ہو گئے۔ جاوید اقبال نے انگلستان میں سات برس گزارے، وہ ستمبر ۱۹۵۶ء کو پاکستان واپس آئے انگلستان میں قیام کے دوران میں انہوں نے فرانس، جرمنی، اٹلی اور سپین کی سیاحت بھی کی انہیں مہینے کا پچاس پونڈ سکالرشپ ملتا تھا۔ دیگر ذرائع سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی وہ بی بی سی سے ایسٹرن سروس کے لئے ''اے لیٹر فرام کیمرج'' کے عنوان سے لیکچر دیتے تھے اس لئے پردیس میں انہیں مالی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

انگلستان سے واپسی پر جاوید اقبال نے وکالت شروع کی اور ساتھ ہی لاء کالج میں لیکچرار اور ریڈر کی حیثیت سے پڑھانا شروع کیا۔ انہوں نے لاء کالج میں ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۰ء تک چودہ برس تک پڑھایا اسی مدت میں انہوں نے ڈرامے سٹیج کرا کے اپنے ذوق کی آبیاری بھی کی۔ ۱۹۷۰ء میں کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے میں الیکشن لڑا مگر ناکام رہے۔ اس ناکامی کے بعد انہوں نے عملی سیاست چھوڑ کر جسٹس کا عہدہ قبول کر لیا۔

جاوید اقبال کی شادی ۱۹۶۴ میں ہوئی اس حوالے سے ''یادیں'' میں لکھتے ہیں:

> ''میری بیوی ناصرہ ڈاکٹر عبدالوحید صاحب آف فیروز سنز کی بیٹی ہیں اور ان سے میری پہلی مرتبہ ملاقات نیویارک میں ۱۹۶۲ء میں ہوئی تھی کیونکہ وہ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اپنے والد کے ساتھ یو این او آئی تھیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو ملنے اور جاننے کے مواقع وہیں ملے۔ جب وہ لاہور واپس آئیں تو ہماری شادی ہو گئی۔'' (۷)

جاوید اقبال کے پہلے بیٹے کی پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ہوئی اور دوسرا بیٹا ولید یکم اگست ۱۹۶۷ء کو پیدا ہوا۔ جاوید اور ناصرہ کی زندگی آسودگی سے گزری۔ بڑے صاحبزادے کو پولیٹیکل سائنس سے دلچسپی ہے جبکہ چھوٹے نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ چھوٹے صاحبزادے کو اداکاری سے دلچسپی ہے اور یہ شوق انہیں وراثت میں ملا ہے۔

فلسفہ کا علم اور عدلیہ دو ایسے شعبے ہیں جن میں خیالات اور مواد کو پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ فلسفی ہر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے منطق اور استدلال کا سہارا لیتا ہے اس لئے فیصلہ عجلت میں نہیں کرتا۔ عدلیہ سے تعلق کا یہ فائدہ ہے کہ پھیلے ہوئے مواد یا فیصلوں کو مربوط کر کے مقصد حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جاوید اقبال کی شخصیت اور پیغام کو سمجھنے میں انہیں فلسفے سے بہت مدد ملی ہے اور کتابوں کے حوالے سے رطب و یابس کی چھان پھٹک میں عدالتی نظام کی تربیت ان کے کام آئی ہے۔ ان کی کتاب ''زندہ رود'' کی پہلی جلد پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے پچاس ہزار روپے انعام دیا اور ۱۹۸۸ء میں ''زندہ رود'' کی تینوں جلدوں پر پچاس ہزار روپے کا صدارتی انعام دیا گیا۔ جاوید اقبال کی کتاب ''زندہ رود'' کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ ان کی گراں قدر خدمات کے سبب کئی یونیورسٹیوں نے انہیں مختلف اعزازات سے نوازا ہے۔

☆☆☆

(ب)

اردو میں سوانح نگاری کی روایت

قصہ کہانی اور داستان کی طرح سوانح عمری بھی بیانیہ اظہار کی ایک قدیم شکل ہے۔ زمانۂ قدیم سے انسان اپنی پسندیدہ شخصیات اور ممدوحین کی صفات اور خصوصیات کو انتہائی دلچسپی اور شغف سے سنتا رہا ہے۔ سوانح نگاری کے آغاز کے بارے میں مختلف ناقدین اور مورخین نے مختلف زمانوں کو نقطۂ آغاز قرار دیا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوانح عمری سے دلچسپی انسانی نفسیات کا حصہ ہے۔

جب کوئی شخص اپنی گزری ہوئی زندگی کے واقعات تحریر کرے تو اصطلاح میں اسے ''آپ بیتی'' یا ''خودنوشت'' سوانح عمری کہا جاتا ہے۔ اگر سوانح حیات خود لکھی جائے تو اسے خودنوشت کہا جاتا ہے اور اگر کوئی دوسرا اسے تحریر کرے تو یہ صرف سوانح عمری کہلاتی ہے۔ عام طور پر خودنوشت لکھنے والا ذاتی واقعات بیان کرتے ہوئے اس دور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالت بھی بیان کر دیتا ہے اور ہمیں سوانح عمری میں ذاتی حالات کے علاوہ بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔

انسانی نفسیات کا یہ خاصہ ہے کہ انسان کو دوسرے کی کہانی میں بعض اوقات وہ مزہ آتا ہے۔ جو اپنی کہانی میں نہیں آتا، خاص طور پر جب واقعات کو کہانی کی صورت میں بیان کیا جائے اور حکمت و فلسفہ اور پند و موعظت کے عناصر پر زیادہ زور نہ دیا جائے اگر آپ بیتی کو دوسروں کی بھاری بھرکم تصنیفات میں اضافہ کرنے کے لیے نہ لکھا گیا ہو بلکہ بھولی ہوئی یادیں تازہ کرنے' مٹے ہوئے نقوش اجاگر کرنے اور اپنی زندگی کی داستان سنانے کے لیے لکھا گیا ہو تو وہ زیادہ موثر ہو سکتی ہے۔ جذبات نہ ہوتے تو دنیا کا ادب مصنوعی اور خارجی بن کر رہ جاتا اور ادب اور شاعری کا گراں قدر سرمایہ وجود میں نہ آتا یہ سنانے والے کا سلیقہ ہے کہ وہ اپنی داستان کو کس حد تک صداقت اور دیانت کے ساتھ پیش کرتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں ایک ادیب اور غیر ادیب کا فرق ظاہر ہوتا ہے

آپ بیتی سوانح نگاروں کے لیے بھی مفید مواد فراہم کرتی ہے۔اپنے حالات لکھنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ شخصیات کے فن، فکر اور کارناموں کے حوالے سے مستند مواد فراہم ہو جاتا ہے۔اہم واقعات زندگی کی باریک جزئیات اور ان کے پس پردہ انسانی محرکات کا سلسلہ بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے۔لکھنے والے کے ذہن میں آپ بیتی کا مواد پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے اور اسے کسی قسم کی چھان بین نہیں کرنا پڑتی۔آپ بیتی میں اپنی ملامت یا اپنی تحسین کی طرف بے توازن جھکاؤ ہو تو بھی آپ بیتی دوسرے سوانح نگاروں کے لیے اوّلین اور مستند مآخذ ثابت ہوتی ہے۔

سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں مختلف مقاصد کے تحت لکھی جاتی ہیں۔کسی شخص کی یاد منانے کے لئے، تجسس کی تسکین کے لئے، ذاتی پس منظر کے حوالے سے، تخلیقی زندگی کی وضاحت کے لئے، کسی ایک دور یا تحریک سے وابستہ لوگوں کے ذہنی رجحانات کے جائزے کے لئے۔سوانح عمری کا موضوع بننے والی ہستیاں اپنے عظیم الشان کارناموں کے باعث ہمیشہ زندہ رہتی ہیں اور زندگی کے یادگار واقعات کے حوالے سے سوانح عمریاں قابل معتبر مواد فراہم کرتی ہیں جو مستقبل کے محقق کے لئے سودمند ثابت ہوتا ہے۔

سوانح کا موضوع اپنی کارکردگی کی بنا پر کوئی مشہور شخص ہوتا ہے۔اس لئے اس کی زندگی کے واقعات اپنے تاریخی تناظر میں تاریخی سچائی اور سائنسی صداقت کے ساتھ بیان کرنے کا نام سوانح ہے۔اس اعتبار سے سوانح کو تاریخ کی ایک شاخ بھی کہا گیا ہے۔لیکن اس میں غالب خصوصیات ایسی ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ادبی ہیں۔اس سلسلے میں دو اہم پہلو بنیادی خصوصیات قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ایک تو زبان و بیان کے پیرائے اور وہ وسائل جو اظہار کو تاثیر اور پرکشش بناتے ہیں اور دوسرے سوانح اور بعض ادبی اصناف کی وہ خصوصیات جو ان میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً تخلیقی غرض و غایت وغیرہ۔ڈاکٹر شاہ علی سیّد کے بقول:

> ''سوانح نگاری میں کامیابی اس وقت ممکن ہے جب کہ موضوع اور بیان دونوں عمدہ ہوں۔ان میں سے ایک، دوسرے کی تلافی نہیں کرسکتا۔اس کے علاوہ ایسی سوانح عمریاں تو کافی مل جائیں گی جن کے موضوع عمدہ ہوں لیکن لکھی عمدگی سے نہ گئی ہوں۔

لیکن ایسی کم یاب ہیں جن کے موضوع نامناسب ہیں اور جن کا بیان سوانح نگاری کے معیار پر پورا اترتا ہو۔''(۱)

سوانح نگاری پر کم وبیش ہر لکھنے والے نے جہاں موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، وہاں اس نے موضوع سے ایک عمومی شخصیت مراد لی ہے اور موضوع یا شخصیت کو نہ تو مختلف اقسام میں رکھ کر دیکھا ہے اور نہ ہی مختلف نوع کے سوانح کی حدود بیان کی ہیں، ایسا کرنا اس لئے لازم ہے کہ ایک جرنیل ایک سیاست دان، ایک صحافی، ایک اداکار، ایک مصوّر اور ایک ادیب یا شاعر یا اگر کسی ایک شخصیت کے ایک سے زیادہ پہلو یا حیثیتیں ہیں تو ان کے سوانح کی پیشکش کے تقاضوں کو سمجھا اور سمجھایا جائے۔ ادب میں شخصی احوال کا مطالعہ ایک عمدہ سوانح عمری کی بدولت مفید اور سودمند ثابت ہوتا ہے۔

اپنی ذات کے بارے میں اظہار خیال کرنا اور اپنے تجربوں میں دوسروں کو شریک کرنا بہت پرانا رویّہ ہے۔ اظہار ذات کا رجحان انسان میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔ اردو نثر میں اس کے ابتدائی نقوش ہمیں صوفیائے کرام کے ملفوظات وغیرہ میں ملتے ہیں۔ لیکن انہیں ہم آپ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی کی غیر شعوری کوشش کہہ سکتے ہیں میر تقی میر کی آپ بیتی ''ذکرِ میر'' فارسی میں لکھی گئی اس آپ بیتی میں انکشاف ذات کا رویّہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ رویّہ میر کی شاعری میں بھی موجود ہے لیکن اگر میر اپنی آپ بیتی نہ چھوڑ جاتے تو شاید میر کی مخصوص افتادہ طبع اور غم پسندی ہمیشہ مبہم ہی رہتی۔ اردو میں پہلے پہل دکن کی کچھ ایسی مثنویاں ملتی ہیں جن میں بعض شاعروں نے اپنے حالات زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اس کام کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ اردو میں خودنوشت سوانح حیات کی جھلکیاں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہیں مگر مستقبل طور پر آپ بیتی کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ آپ بیتی کے فن کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''ایک لحاظ سے آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہوتی ہے اس کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں ہوتی ہیں دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔''(۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ براہ راست آپ بیتی ممکن نہیں ہے البتہ بالواسطہ کوششیں کامیاب ہوسکتی ہیں وہ ناول کو اپنے احساسات کی سرگزشت لکھنے کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں جس میں ''سرّ دلبراں'' کو ''حدیث دیگراں'' بنا کر پیش کرنا ممکن ہے۔

آپ بیتیاں سوانح نگاروں کے لئے مفید مواد مہیا کرتی ہیں بڑے بڑے مفکروں اور ادیبوں سیاستدانوں اور شاعروں نے جب بھی اپنے حالات لکھے ان کے فکر وفن اور کارناموں کے ارتقاء پر مستند مواد کی فراہمی ممکن ہوئی۔ اچھی آپ بیتی وہ ہے جس میں کسی بڑے دعوے کے بغیر بے تکلف اور سادہ انداز میں احوال زندگی کی تفصیلات موجود ہوں۔

پروفیسر سید احتشام لکھتے ہیں:

> ''غالباً ایڈمنڈ گاس نے کہا ہے کہ سوانح عمری لکھنے والے ایک بہت بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ زندگی اور زمانے کو ملا دیتے ہیں باوجود غور کے یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ایڈمنڈ گاس کا حقیقتاً مقصد کیا ہے کیونکہ افراد خلائی پیداوار نہیں ہوتے اور جب ان کے لئے سماجی عمل کو کس طرح نظر انداز کرسکتا ہے یہیں سے لکھنے والے کے نقطۂ نظر کی بنیاد کا مسئلہ بھی کسی قدر حل ہوجاتا ہے۔ سوانح نگار ڈرامہ یا ناول لکھنے والے کی طرح کوئی تخلیقی چیز نہیں پیش کرتا بلکہ ایک دیئے ہوئے مواد کی ترتیب اپنے خیال کے مطابق کرتا ہے اور اس کا اپنا خیال بہت سے نفسیاتی اور معاشرتی رجحانات سے بنتا ہے۔''(۳)

اردو میں دستیاب ہونے والی پہلی تحریر جو خودنوشت کی صفت رکھتی ہے اور مصنف کی زندگی کا تقریباً پورا احاطہ کرتی ہے مولانا محمد جعفر تھانیسری کی کتاب ''تاریخ عجیب کالا پانی'' ہے۔ ایک مجاہد آزادی کی حیثیت سے انہوں نے انڈمان میں کالے پانی کی سزا کاٹی ہے۔ اس خودنوشت کی اہمیت اوّلین آپ بیتی ہونے کے علاوہ اس لئے بھی ہے کہ یہ اس زمانے میں لکھی گئی جب حق گوئی کیلئے زبان پر مہریں لگی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اہل دہلی کی کیفیات کے بیان کے سلسلے میں منشی محمد عنایت حسین کی ''ایامِ غدر'' بھی بہت اہم ہے اس کے مطالعے سے لال قلعے کی زوال پذیر تہذیب اور معاشرے کی تاراجی کا اندازہ ہوتا ہے اگرچہ ان آپ بیتیوں میں بہت احتیاط اور

اختصار سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سیاسی نظریات اور دلی کیفیات کا اظہار ہر لفظ سے ملتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی بھی بہت اہمیت کی حامل ہے جسے وہ اپنی ''عرفان ہستی کا بہی کھاتہ'' کہتے ہیں۔ دیوان سنگھ مفتوں ''مدیر ریاست'' کی خودنوشت سوانح حیات ''ناقابلِ فراموش'' برملا گوئی اور اپنی شگفتہ بیانی کے سبب اردو خود نوشت کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں ان کی اصول پرستی کی جھلکیاں ان کے کردار پر جابجا روشنی ڈالتی ہیں ''ناقابل فراموش'' کا ہر واقعہ، ہر قصہ دلچسپ سبق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلوب کی تاریخ میں مولانا آزاد کی طرز تحریر کو تجریدی آرٹ بھی کہا گیا ہے۔ مولانا اپنی خود پسندی کے باعث ہر خاص و عام کے سامنے زندگی کے سارے اسرار و رموز الم و طرب کی تشہیر کرنا پسند نہیں کرتے۔ ذیل میں علامہ اقبال کا ایک خط نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوگا کہ علامہ اقبال سوانح نگاری کے سلسلے میں کن امور کو پیش نظر رکھنا چاہتے تھے۔ یہ خط ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء کے ہفتہ وار اخبار ''پنجہ فولاد'' لاہور میں شائع ہوا۔

> ''ماہ رواں کے کسی اخبار میں میں نے پڑھا تھا کہ فن سخن کے استاد اور ملک نظم کے بادشاہ امیر مینائی کی لائف ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ راقم مضمون نے جناب امیر مرحوم کے اکثر تلامذہ اور بالخصوص حضرت جلیل، مضطر، کوثر، عابد اور ان کے خلف ارشد کو متوجہ کیا ہے کہ ایسا شاعر بینظیر اور ان کی لائف اب تک نہ لکھی جائے، بے شک یہ حیرانی کی بات ہے کہ کیوں اب تک فنِ سخن کے قدردان بزرگوں نے امیر مرحوم کی شاعرانہ اور پبلک زندگی کو کاغذی جامہ نہیں پہنایا جس کے دیکھنے کے لئے سخن فہم طبیعتیں بے چینی سے منتظر ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایسے صاحب کمال کی سوانح عمریاں ایک نہیں کئی لکھی جاتیں اور کئی کئی بار چھپتیں مگر
>
> ع: اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے''۔
>
> حضرت امیر کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا درجہ شاعری سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد اور

ایک خاص قسم کی لے پائی جاتی ہے۔ جو صاحب دلوں کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ آہ! ایسے بے نظیر شخص کے حالات جو اصلی معنوں میں تلمیذ الرحمٰن کہلانے کا مستحق ہو، ابھی تک گمنامی میں پڑے رہیں، اندھیر نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر یہی شخص یورپ یا امریکہ میں ہوتا تو اس کی زندگی میں ہی اس کی کئی سوانح عمریاں نکل جاتیں۔ مگر افسوس ہے ہندوستان میں ان کی زندگی میں تو درکنار ان کی وفات کے بعد بھی ان کی کوئی لائف نہ لکھی گئی۔ میرا ایک عرصے سے خیال تھا کہ حضرت امیر کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات قلم بند کروں مگر اب مرحوم کی لائف کے متعلق ایک تازہ مضمون دیکھ کر پھر امنگ آئی ہے کہ جس طرح ہو میں اپنے کام کو پورا کروں اور بہت جلد۔

میرا مقصد اصل میں حضرت امیر کی شاعری اور شاعرانہ لائف پر بحث کرنے کا ہے اس لئے چند باتیں حضرت امیر کے تلامذہ اور دیگر واقف کاروں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ حضرت امیر کی کوئی ایسی بات جس نے ان کی زندگی یا شاعری پر کوئی خاص اثر کیا ہو

۲۔ ان کے زبانی مقولے

۳۔ ان کے بچپن کی بعض باتیں جن سے ان کی آئندہ عظمت کا پتا چلتا ہو

۴۔ انہوں نے کس کس مقام کا سفر کیا اور کیوں؟

۵۔ کس کس استاد سے کیا کیا حاصل کیا؟

۶۔ ان کی عام عادات

۷۔ چند ایک مشاعروں کی مفصّل کیفیت'' (۴)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال سوانح نگاری اور اس کے فن کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے

ALLAMA IQBAL
Open University Library
(ACQUISITION SECTION)
113169
Acc.
Date 29-08-09

اور اپنے اپنے زمانے کی مشہور شخصیات کے حوالے سے اہم واقعات اور معلومات کی فراہمی میں سوانح کی اہمیت کے قائل تھے۔

اردو کی سیاسی آپ بیتیوں میں مولانا حسرت موہانی کی ''قیدِ فرنگ'' کو خاصی اہمیت حاصل ہے مولانا نے بڑی ایام جرأت اور حق گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنے ایّام قید و بند کا جائزہ لیا ہے اس کے علاوہ چودھری افضل الحق کی دو آپ بیتیاں ''دوزخ'' اور ''میرا افسانہ'' کا شمار بھی اس دور کی سیاسی آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔ پولیس کے محکمے میں ملازم ہونے کی وجہ سے اگر چہ سیاست ان کے لئے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی لیکن انہوں نے اپنے زمانے کی سیاست پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔

نواب ڈاکٹر سر احمد سعید خان آف چھتاری کی خودنوشت سوانح ۱۹۴۹ء میں ''یادِ ایام'' کے عنوان سے شائع ہوئی یہ خودنوشت دوسری تمام خودنوشتوں سے قدرے مختلف حیثیت کی حامل ہے۔ نواب چھتاری انگریزوں کے زمانے میں وزیر گورنر اور ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم جیسے عہدوں پر فائز رہے۔ صلح کی پالیسی پر کار بند رہنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ حکومت وقت کے خاص آدمیوں میں شمار کئے جاتے رہے۔ ''یادِ ایام'' میں ان کے مختلف کارناموں کی تفصیل تو ملتی ہے لیکن دل کو چھو لینے والی کیفیت ان کی تحریر میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ تمام تذکرے سپاٹ ہیں تحلیلی تجزیے کو ان کی تحریر میں دخل نہیں ہے۔

''مشاہدات'' ۱۹۵۵ء ہوش بلگرامی کے گوناگوں تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہے۔ یہ کتاب حیدر آباد کی تاریخ کے پُر آشوب دور میں لکھی گئی۔ ہوش یار جنگ کا حیدر آباد کی سیاست سے گہرا تعلق رہا ہے اس تصنیف میں حقیقت کی تلخی کے ساتھ زبان کی حلاوت ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہے عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت'' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی سالک بنیادی طور پر خاکہ نگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتی میں بھی خاکہ نگاری کا رنگ نمایاں ہے۔ ۱۹۶۷ء میں یوسف حسین خان نے اپنی یادیں ''یادوں کی دنیا'' کے عنوان سے مرتب کیں۔ چونکہ اس خودنوشت کو مرتّب کرنے والا ایک مورخ ہے۔ لہٰذا اس خودنوشت میں خصوصی منصوبہ بندی اور ترتیب سے کام لیا گیا ہے یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ اس وقت تک خودنوشت کی تاریخی اور سوانحی اہمیت کا احساس خودنوشت سوانح نگاروں کے یہاں بیدار ہو چکا تھا۔

اردو کی تمام خودنوشت سوانح عمریوں کو اگر تاریخی اعتبار سے سلسلہ وار پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی سوانح عمریاں بہت کم ہیں جن میں سیاسی کشمکش اور معاشرتی انتشار کی عکاسی نہ ہو۔ اردو خودنوشت سوانح نگار اپنے ساتھ اپنے پس منظر کو ہمیشہ نظر میں رکھتا ہے "بوئے گل" نالۂ دل دود چراغ محفل" شورش کاشمیری کی پُر آشوب زندگی کی داستان ہے۔ یہ آپ بیتی ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ شورش کی تین آپ بیتیاں اور ہیں "تمغۂ خدمت، موت سے واپسی پسِ دیوارِ زنداں" شورش کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی زندگی میں ادب اور سیاست پہلو بہ پہلو چلتے ہیں اگر ایک طرف وہ اپنے سیاسی مسلک پر اظہار خیال کرتے ہیں تو دوسری طرف لاہور کی ہر قابل ذکر ادبی ہستی اور ادبی تحریکوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ شورش کی آپ بیتی میں ذہنی نشو نما اور ذہنی ارتقا کے موضوع پر کھل کے بات کی گئی ہے یہ وہ موضوع ہے جسے انگریزی خودنوشت میں جدید رجحان کے بموجب سب سے اہم عنصر سمجھا جاتا ہے مگر اردو آپ بیتی نگار اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اب بھی جھجکتے ہیں۔

اردو میں اب تک جتنی آپ بیتیاں منظر عام پر آئی ہیں ان میں جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی "یادوں کی بارات" ۱۹۷۰ء ایسی ہے جو خود کشائی کے بے باک رویّے کے تحت لکھی گئی ہے۔ جوش کی آپ بیتی اردو آپ بیتی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ بداعمالیوں کی تشہیر جوش کی آپ بیتی کا عیب ہے اور ان کا ہنر بھی۔ "یادوں کی بارات" اردو کی ان نثری تصنیفات میں سے ہے جن کی شدت کے ساتھ تحسین، تنقیص اور تنقید کی گئی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوش کی خودنوشت فن اور شخصیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

کلیم الدین احمد کی "اپنی تلاش" خواجہ السیّدین کی "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں" اور احسان دانش کی "جہانِ دانش" بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ کلیم الدین احمد کی شخصیت اور فن دونوں کی حیثیت اردو ادب میں بڑی چونکا دینے والی رہی ہے اس لئے ان کی خودنوشت سے توقع تھی کہ وہ ان کی پُراسرار شخصیت اور مخصوص ادبی رویّے کو سمجھنے میں مددگار ہوگی مگر اس تصنیف میں ان کی اپنی شخصیت منتشر خیالات میں ایسی گم ہوئی ہے کہ قاری آخر تک اسے تلاش ہی کرتا رہتا ہے کلیم الدین احمد صنف خودنوشت سوانح پر اپنی انفرادیت کا کوئی نشان ثبت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

خواجہ غلام السیّدین اپنی خودنوشت "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں" ۱۹۷۴ اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے

جسے بعد میں ان کی بہن صالحہ عابدہ حسین نے مکمل کیا ہے۔ اس خودنوشت سوانح کے نامکمل حصے بھی سیّدین کی سادہ لوح اور منکسر طبیعت کی مکمل تصویر قاری کے سامنے کھینچنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ماہر تعلیم ہونے کی وجہ سے ان کی تحریر میں اصلاحی اور اخلاقی پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔

۱۹۷۵ء میں احسان دانش کی خودنوشت ''جہانِ دانش'' کے عنوان سے شائع ہوئی ''جہانِ دانش'' کو اگر اردو کی بہترین خودنوشت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انکشافِ ذات کے ضمن میں انہوں نے اپنی کمزوریاں اس طرح یکجا کردی ہیں کہ ان کی شخصیت جگہ جگہ سے مسخ ہوگئی ہے لیکن احسان دانش کی کمزوریاں اور محرومیاں ہی ان کی شخصیت کے دھندلے دھندلے نقوش اجاگر کرتی ہیں دھند چھٹتی ہے اور انسانیت اور رواداری کے جذبوں سے خلوص کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں۔

۱۹۷۸ء میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی ''آپ بیتی'' شائع ہوئی آپ بیتی کا طرز تحریر سادہ شگفتہ اور اپنے اندر علمی وقار لئے ہوئے ہے۔ یہ آپ بیتی اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ مولانا نے الحاد سے اسلام کی طرف جانے والی مختلف منزلوں کی نشان دہی بڑی تفصیل سے کی ہے۔ الحاد کے بعد اسلام کی طرف واپس آنے کا تجزیہ خوبصورت ہے۔ مولانا کی آپ بیتی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی خودنوشت میں ہونی چاہئیں۔

۱۹۷۶ء میں مشتاق احمد یوسفی نے اپنی سرگزشت ''زرگزشت'' کے عنوان سے مرتب کی مزاح کے پیرائے میں یوسفی وہ باتیں کہہ گئے ہیں جسے سنجیدہ گفتگو میں زبان تک لانا محال تھا۔ یوسفی کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ ادب کے کلاسیکی رچاؤ اور علاقائی زبانوں کی توانائی ملتی ہے۔ یوسفی کی آپ بیتی اپنے اسلوب کی وجہ سے اردو میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

دور حاضر کی خودنوشت سوانح عمریوں میں سب سے معرکۃ الآراء سوانحی تصنیف قرۃ العین حیدر کی ''کار جہاں دراز ہے'' ہے۔ اگرچہ مصنفہ نے اسے سوانحی ناول یا ''فیملی ساگا'' ہی تسلیم کیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ سوانحی ادب کا عظیم الشّان کارنامہ ہے۔

آپ بیتی میں صحیح اظہار کے لئے استعارے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں ان سے آگے بڑھنا چاہیں تو

شاعری کرلیں پانی کی ان گنت موجوں کی طرح آپ بیتی کی وسعت بھی بے کراں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں مختلف آپ بیتی لکھنے والے نے اپنے اپنے انداز میں اپنی زندگی کے واقعات اور مشاہدات کا اظہار مختلف طور پر کیا ہے۔اظہار و بیان کا یہ اختلاف ہی آپ بیتیوں کی دلچسپی کا سبب ہے۔ایک ہی زمانے میں رہنے والے ادیبوں نے اپنے زمانے اور ماحول کو مختلف انداز میں دیکھا اور اس کی عکاسی مختلف اسلوب میں کی۔

(ج)

''اپنا گریباں چاک'' کا تعارفی مطالعہ

کتاب کی اشاعت:

بیسویں صدی میں اردو میں چھوٹی بڑی سینکڑوں سوانح عمریاں شائع ہوئیں۔اس صنف کو اس دور میں جتنی ترقی ملی اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔اس دور میں مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے اردو ادب کے دامن کو سوانح عمری کی صنف نے وسیع کیا''اپنا گریباں چاک'' کا شمار اس صدی کے آخری عشرے میں شائع ہونے والی سوانح عمریوں میں اس لئے نمایاں طور پر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اردو ادب وشعر کی انتہائی اہم شخصیت علامہ اقبال کے فرزند ارجمند سے ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' کی فکری وفنّی خوبیوں کا جائزہ لینے اور اردو سوانح عمریوں میں اس کے مقام ومرتبہ کو دیکھنے سے پہلے ہمیں اس کی ترتیب پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔واضح رہے کہ اس کتاب کی موجودہ اشاعتی ترتیب اور سوانحی حالات کے ذیل میں تصاویر کی شمولیت قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں۔یہ تصاویر ایک منفرد اضافہ ہیں جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے اور اردو کی سوانح عمریاں عام طور پر (سوائے چند تصویروں کے) بے تصویر ہُوا کرتی ہیں۔

اشاعتی ترتیب (Lay out) کا تعارف:

جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال کی خود نوشت سوانح حیات ۱/۲-۵ سائز کی ۱۸۸ صفحات پر مشتمل ہے ۸۲ تصاویر کے صفحات متن کے علاوہ ہیں یوں مجموعی طور پر کتاب کے کل صفحات ۴۰۰ ہیں۔

روشنِ فانٹ سائز ۱۶ میں ٹائپ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا اشاعتی اور طباعتی حوالہ ادارہ نے یوں دیا ہے۔

"923.4 Javed Iqbal, Justice Rtd. Dr.
Apna Grebaan Chaak/ Justice Rtd. Dr.
Javed Iqbal Lahore: Sang-e-Meel
Publication. 2003
288P Photos 112"
I.Swanch I.Title

۲۰۰۳ء نیاز احمد نے سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے شائع کی

"ISBN 969-35-1369x Sang-e-Meel Publications
2..... Chowk Urdu Bazar Lahore Pakistan"

کتاب کا آغاز پیش لفظ:

اس سوانح عمری کی ترتیب میں پہلا صفحہ کتاب کی لوح ہے جس پر یہ عبارت لکھی ہے

(خودنوشت سوانح حیات)

جسٹس (ریٹائرڈ)

ڈاکٹر جاوید اقبال

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

یہ عبارت پورے صفحہ پر نمایاں طور سے درج ہیں دوسرے صفحہ پر کتاب کا اشاعتی کوائف نامہ ہے۔ تیسرے صفحہ پر ان لوگوں کے شکریئے کے الفاظ درج ہیں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں مشورے اور آرا دیں یہ عبارت یوں ہے۔

"میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے مسودے کو بغور پڑا اور اپنی تجاویز سے مجھے استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ اس طرح جناب تنویر قیصر، شاہد بیگم، ناصرہ اور بیٹوں منیب اور ولید کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی آرا سے مجھے نوازا۔(۱)

"تشکر کی یہ عبارت کھلے انداز میں مصنف کے نام کے ساتھ ۸ سطروں میں

پھیلی ہوئی ہے۔''

چوتھے صفحہ پر علامہ اقبال کے یہ دو شعر ہیں:

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
جو ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری
تو اے مولائے یثربؐ، آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زنّاری

(۲)

یہ اشعار نہ صرف جاوید اقبال کے ذوق شعر بلکہ ''اپنا گریباں چاک'' (ان کی سوانح حیات) کے حوالے سے خاص معنویت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان میں تہذیب حاضر کی آزادی، ظاہر، باطن گرفتاری کے الفاظ (پہلے شعر میں) اس کشمکش کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو موجودہ زمانے کی عطا ہے اور جس نے تمام حساس تعلیم یافتہ اور جدید ذہن رکھنے والے لوگوں کو ایک مسلسل اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جدید تعلیم اور سوچوں نے ہمیں بظاہر آزادی تو دی ہے مگر یہ آزادی صرف دکھاوے کی ہے۔ کہنے کو تو عصر حاضر میں بسنے والے لوگ آزاد ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ مختلف سیاسی سماجی معاشرتی اور اقتصادی پابندیوں کے اندر جکڑے ہوئے ہیں۔ آج سے دو چار صدیاں پہلے کے اس انسان کی طرح جو صحراؤں اور کوہستانوں میں اپنی مرضی اور آزادی سے رہتا تھا۔ اور علامہ اقبال ہی کے ایک اور شعر

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مرد کہستانی

(۳)

کے مطابق جس کا تعلق، فطرت کے ساتھ براہ راست تھا اور وہ بندہ صحرائی یا مرد کہستانی نہ صرف اپنی ذات کی آزادی سے مطمئن تھا بلکہ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کا فریضہ بھی سرانجام دیتا تھا اب نئے دور کی مشینی

تقاضوں کا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑے ممالک اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے بڑے معاشی اور کاروباری اداروں نے اسے اپنی اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں میں جکڑ لیا ہے۔ آج کے دور میں ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی اقتصادی منصوبہ بندیوں کے زیرِ اثر اس کو آزادانہ کام کرنے کا موقع بھی نہیں دیتیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں پٹرول اور بجلی کے نرخوں کا تعین بھی ان کے مشورے اور حکم سے ہوتا ہے اور یہی وہ گرفتاری ہے جس میں ہم انفرادی اور قومی سطح تک غلام ہو چکے ہیں۔

علامہ اقبال کے دوسرے شعر میں مولائے یثرب چارہ سازی، افرنگی، دانش اور زناری ایمان کے الفاظ پہلے شعر کی معنویت کو اور ابھارتے ہیں۔ یہ شعر استمداد اور استغاثہ کا شعر ہے نعتیہ شاعری میں استمداد اور استغاثہ حضور ﷺ کے دربار میں فریاد کے بعد مدد طلب کرنے کے ذیل میں آتے ہیں۔ پہلے شعر میں علامہ اقبال نے باطن کی گرفتاری کا رونا رویا ہے دوسرے میں حضور اکرم ﷺ کے حضور استمداد کرتے ہیں کہ میں جس گرفتاری اور عذاب میں ہوں اس سے میں اپنی کوشش یا اپنے آس پاس بسنے لوگوں کے تعاون سے نہیں نکل سکتا۔ حضور اکرم ﷺ آپ میری مدد فرمائیں میرے دکھوں کا مداوا کریں میری چارسازی کریں میرے پاس اپنی بصیرت اور عقل کا کوئی ایسا قرینہ نہیں جس سے میں اس کشمکش اور اضطراب سے نکلوں۔ میرے پاس جو عقل و دانش ہے وہ بھی افرنگی تعلیم و تہذیب کی عطا کردہ ہے اور میرے پاس ایمان کی جو رمق یا اثاثہ ہے وہ بھی خالص نہیں اس پر ہندی تہذیب و تمدن کے اثرات ہیں۔

یہاں علامہ اقبال نے افرنگی اور زنّاری کے الفاظ انگریزی اور ہندی تہذیب کی علامتوں کے طور پر استعمال کئے ہیں۔

علامہ اس شعر میں بتانا چاہتے ہیں کہ انگریزی تعلیم اور ہندوستانی معاشرت میں رہن سہن کے اثرات کے سبب میری دانش اور ایمان کی حالت اور کیفیت خالص نہیں رہی۔ تشکیک، اندیشوں، وسوسوں اور گمان کی وجہ سے میرے دل کو وہ سکون نہیں مل رہا جو سچّے ایمان اور نورانی دانش کی عطا ہوتا ہے میں اس کشمکش اور اضطراب سے نکلنا چاہتا ہوں لہٰذا وہ حضور اکرم ﷺ سے توجہ کی نظر طلب کرتے اور چارہ سازی کی درخواست کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید قبال نے ان اشعار کا بڑا برمحل استعمال کیا ہے۔ علامہ اقبال جن کیفیات سے گزر رہے تھے جاوید اقبال بھی دانش و ایمان کے حوالے سے انہی کیفیات سے گزر رہے ہیں۔ یہ شعر بجا طور پر ان کیفیات کی

ترجمانی کرتے ہیں ان اشعار کی شمولیت مصنف کے اپنے نفس مضمون، اپنے احوال کے خلاصے کی سی ہے۔
اپنی زندگی کے حال احوال قلمبند کرتے ہوئے فطری طور پر انسان کا ضمیر اسے ان کیفیات میں مبتلا کر دیتا ہے جن کے ترجمان یہ شعر ہیں۔

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومت عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں
اک اضطراب مسلسل غیاب ہو کہ حضور
میں خود کہوں تو مری داستان دراز نہیں
(۴)

''اپنا گریباں چاک'' کے شروع صفحہ پیش لفظ سے قبل ان اشعار کو ایک دلآویز ابتدائیہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے یہ اشعار نہ صرف یہ کہ جاوید اقبال کے حقیقی ترجمان ہیں بلکہ شعر شناسی اور ذوق شعر کے حوالے سے بھی لائق تحسین ہیں۔

پیش لفظ:

کتاب کا پیش لفظ صفحہ ۷ سے ۹ تک مختصر مگر جامع ہے اس کا مرکزی خیال اردو ادب میں سوانح عمری لکھنے کے مسائل سے ہے خاص طور پر وہ مسائل جو انسان کی انا سے متعلق ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے حالات زندگی لکھتے ہوئے متذبذب رہتا ہے جاوید اقبال کے بقول۔

''اردو ادب میں اپنے سوانح حیات خود تحریر کرنے کا رواج نہیں۔ اس لئے ادب کی اس صنف کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی۔ ممکن ہے کہ اس کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہو کہ ہماری تہذیب میں اپنی اَنا کو دبا کر رکھنا یا مارنا ہمارے نزدیک ایک اہم اخلاقی فریضہ ہے۔ کسی سے ملتے وقت ادب سے جھکنا سینہ پر ہاتھ رکھنا ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، گھٹنا چھونا، پاؤں پکڑنا، غیر ضروری عجز و انکساری کا اظہار کرنا یا خطوں میں اپنے آپ کو فدوی، خاکسار، یا کمترین تحریر کرنا اسی اخلاقی تصور کے مختلف پہلو ہیں اس پس منظر میں خودنوشت سوانح نگاری سے اپنی

انا کو اچھالنا یا خودسری کا مظاہرہ کرنا ہی سمجھا جائے گا جو ایک معیوب بات ہے۔"(۵)

علامہ اقبال نے خودی کی اہمیت کا ذکر کر کے ایسی غلامانہ ذہنیت کو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی سے خارج کرنے کی کوشش کی ہے یہ اقبالی فلسفہ ہی نہیں بلکہ قدرتی حقیقت ہے کہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے ہر انسان یکتا ہے لہٰذا اس ارضی زندگی میں ہر شخص کے تجربات دوسروں سے مختلف ہوں گے اور اگر انہیں خودنوشت سوانح حیات کی صورت میں تحریر کیا جائے تو پڑھنے والوں کے لئے بہرصورت سبق آموز ہو سکتے ہیں۔

جاوید اقبال نے اپنے مختصر سے پیش لفظ میں حیات وممات اور وجود عدم کے مسئلہ کے بارے میں بھی مختصر طور پر نشاندہی کی ہے وہ سمجھتے ہیں۔ وجود انسانی کو نہ روح قرار دیا جا سکتا ہے نہ جسم، یہاں وہ اقبال کے شعروں سے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہیں۔

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے، قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبح ازل سے رہا ہے محو سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن!

(۶)

جاوید اقبال ان اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کرتے کہ انسان سے بحیثیت ایک باشعور فعلِ خدا یہی توقع رکھی جا سکتی ہے کہ اپنی مختصر زندگی میں منتظر ہے گہر ہونے تک یا قطرے سے سخن میں فنا ہونے تک جو بھی اس پر گزرے بیان کر دے تا کہ اس کی سرگزشت سے جو بھی سبق حاصل کرنا چاہے کرے۔

جاوید اقبال کے مختصر سے دیباچے کا آخری حصہ بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ جس میں وہ علامہ اقبال کے حوالے سے اپنی بچپن جوانی اور بڑھاپے کی شناخت پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی اظہار میں ایک جھنجھلاہٹ

ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ علامہ اقبال کے حوالے سے ہٹ کر اپنی جداگانہ شناخت پر اصرار کر رہے ہیں انہیں اس بات کا گہرا احساس ہے کہ میں بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں منایا۔۔۔۔ پہچانا جاتا ہے۔

دیباچے کا اختتام اس اعتراف اور یقین پر ہوتا ہے

"بہر حال میں نے کن حیلوں سے ایک بہت بڑے درخت کے سائے سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تگ و دو کے اس عالم میں کیا میں اس سائے سے نکل کر اپنا سایہ بنا سکا۔؟ میں کس حد تک کامیاب ہوا اور کس حد تک ناکام فقط یہی میری داستانِ حیات ہے؟(۷)

یہ دیباچہ ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۲ لاہور میں لکھا گیا۔"

صفحہ ۱۰ پر جاوید اقبال نے علامہ اقبال کے درج ذیل دو اشعار دیئے ہیں

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

کیا صوفی و ملّا کو خبر میرے جنوں کی
اس کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

(۸)

یہ شعر جاوید اقبال کے مزاج اور ان کے خودنوشت حالات زندگی سے ابھرنے والے مرکزی رویّوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں ، نہ روح ہے، نہ بدن!

(۹)

ان کا انتخاب خوب ہے لیکن حیرت ہے کہ وہ اپنے دیباچہ کو جس بیان پر ختم کرتے ہیں اس کے برعکس وہ اقبال ہی کے شعروں کا سہارا لیتے ہیں اپنی زندگی کی اوریجنلٹی (Orignality) کے اظہار کے لئے علامہ اقبال

ہی کے شعران کے کام آئے۔

جاوید اقبال کے سوانح عمری کے باب اول جنم پتری صفحہ ۱۱ سے قبل کی ترتیبِ کتاب جس کا گزشتہ اوراق میں ذکر کیا گیا ہے درج ذیل ہے۔

سرِ ورق:

جس پر جسٹس (ریٹائر) ڈاکٹر جاوید اقبال ''اپنا گریباں چاک'' خودنوشت سوانح حیات عنوان کے ساتھ جاوید اقبال کی اوپن شرٹ میں خوبصورت نمایاں تصویر ہے جو کسی کشتی سٹیمر میں کھینچی گئی ہے۔ نیلی شرٹ میں یہ تصویر پورٹریٹ (سامنے سے چہرے) کی ہے جس کے پس منظر میں وسیع سمندر نظر آتا ہے۔

۱۔ کتاب کی اندرونی بڑی لوح

۲۔ کتاب کا کوائف نامہ

۳۔ تشکّر

۴۔ شعر جو بال جبریل صفحہ ۳۲۹ پر موجود اس غزل سے لئے گئے ہیں جس کا مطلع ہے

دل بیدار فاروقی ، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

۵۔ ترتیب

۶۔ ۲ شعر جو بال جبریل صفحہ ۳۳۰ پر موجودہ اس غزل سے لئے گئے ہیں جس کا مطلع ہے

خودی کی شوخی وتندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی، تو بے لذتِ نیاز نہیں

۷۔ پیش لفظ کے دو اشعار جو بال جبریل کے صفحہ ۳۲۵ پر موجود اس غزل سے لئے گئے ہیں۔ جن کا مطلع یہ ہے۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں

یوں ''اپنا گریباں چاک'' عنوان کی سوانحی سرگزشت اپنے آغاز اظہار سے پہلے مذکورہ بالا مندرجات پر مشتمل ہے کتاب کا عنوان جاوید اقبال نے جس غزل سے لیا ہے وہ بال جبریل صفحہ ۳۳۳ پر شائع ہے اس غزل کا مطلع یوں ہے۔

یہ دیرِ کہن کیا ہے؟ انبار خس وخاشاک
مشکل ہے گزر اس میں بے نالۂ آتش ناک

اس غزل کا آخری شعر یہ ہے۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا ''اپنا گریباں چاک'' یا دامنِ یزداں چاک

کتاب کے ابواب کی تقسیم:

اگلے صفحہ پر ترتیب کے عنوان سے کتاب کے مندرجات ہیں جو یوں ہیں

پیش لفظ	۷
باب۱ جنم پتری	۱۱
باب۲ چند ابتدائی سال	۱۵
باب۳ جاوید منزل	۲۷
باب۴ اپنے آپ کی تلاش	۴۳
باب۵ انگلستان	۶۵
باب۶ پاؤں میں چکر	۸۹
باب۷ خانہ آبادی	۱۳۳
باب۸ عدل گستری	۲۴۵

باب۹ نظریہ سے انحراف	۱۷۱
باب۱۰ عدالت عظمیٰ کے تین برس	۱۹۷
باب۱۱ مستقبل کی تعمیر	۲۱۳
باب۱۲ سفر جاری ہے	۲۴۹
باب۱۳ دوسرا خط	۲۷۵
خودکلامی	۲۸۵

پیش لفظ اور خودکلامی کے علاوہ کتاب ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کے آگے صفحہ نمبر اس لئے درج کر دیا گیا ہے کہ اس باب کے صفحات سے اس کی ضخامت اور طوالت کا تعین ہو سکے۔ مندرجات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جاوید اقبال نے اپنی ابتدائی زندگی، تعلیم، شادی اور ملازمت کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ ان ابواب کا تفصیلی جائزہ ہم آئندہ صفحات میں لیں گے یہاں کتاب کی ترتیب کے حوالے سے صرف ابواب کی نشاندہی مقصود ہے۔

تصاویر:

''اپنا گریباں چاک'' کا ایک بڑا حصہ تصاویر پر مشتمل ہے۔ جو قریباً پوری کتاب کے ایک چوتھائی سے زیادہ صفحات گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ اردو کی سوانح عمریوں میں اس حوالے سے سب سے منفرد سوانح عمری ہے کہ اس سے قبل اردو میں جتنی بھی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں تصاویر کے صفحے آٹھ دس سے زیادہ نہیں مگر ''اپنا گریباں چاک'' میں تصاویر پر مشتمل صفحات کی تعداد ۸۲ ہے۔

جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح عمری کا ایک اہم حصہ، ان تصاویر کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ ان تصاویر پر نظر ڈالیں تو ہمیں اُن کے بچپن سے جوانی، تعلیمی ادارے، منصبی مصروفیات، اہلیہ اولاد، رفقائے منصب رفقائے سفر، اہم تاریخی و سیاسی شخصیات، دوست، کلاس فیلوز مختلف تقاریب مجالس اقبالیات کے حوالے سے اہل علم و فن اور زندگی کے دوسرے اہم لمحوں کی تصاویر ملتی ہیں۔

انٹرویو میں ''اپنا گریباں چاک میں'' جب راقمہ نے تصاویر کی شمولیت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے اس کا جواب یوں دیا کہ:

''تصویریں تو اس لئے شامل کرلیں تا کہ For question of Truth

آپ نے ''زندہ رود'' کا نیا ایڈیشن نہیں دیکھا جو ابھی چھپا ہے۔

''زندہ رود'' کا نیا ایڈیشن سنگ میل والوں نے چھاپا ہے۔ اس میں انہوں میرے پاس جو بھی علامہ صاحب کی تصویریں تھیں وہ شامل کرلیں تصویروں کی شمولیت اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج کل جو پڑھنے والا ہے وہ visual بھی دیکھنا چاہتا ہے۔''

جاوید اقبال نے اپنی زندگی کے ماہ و سال (جو بہت مصروف گزرے ہیں) سے وابستہ تصویروں کو سوانح عمری میں شامل کرتے ہوئے شعوری طور پر ان تصاویر کا انتخاب کیا ہے پیشتر اس کے کہ ہم نفسیاتی حوالے سے ''اپنا گریباں چاک'' میں شامل اس اہم کام کا تجزیہ کریں ہم ایک نظر ان تصاویر کے کیپشنز پر ڈالتے ہیں۔

۱۔ میرے والد

۲۔ میری والدہ

۳۔ میں والد کی گود میں بعمر ایک سال

۴۔ میں بعمر چار سال

۵۔ والد کے ساتھ بروز عید الفطر ۱۹۳۰ء

۶۔ میں بروز انتقال والد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

۷۔ منیرہ بروز انتقال والد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

۸۔ گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۴۲ء

۹۔ چند دوستوں کے ہمراہ شملہ میں ۱۹۴۴ء

۱۰۔ ۱۹۴۹ میں اور میرے گارڈین دوست شیخ بشیر احمد

۱۱۔ موٹروں کا شوق ۱۹۴۶ء

۱۲۔ موٹروں کا شوق ۱۹۴۷ء

۱۳۔ گورنمنٹ کالج ایم اے فلسفہ ۱۹۴۶ء پروفیسر حمید، سعادت علی خان اور قاضی اسلم کے ساتھ

۱۴۔ ایم اے فلسفہ میں اول آنے پر چانسلر پنجاب یونیورسٹی گورنر مودی سے سونے کا تمغہ لیتے ہوئے

۱۵۔ کیمبرج (انگلستان) کے ایام

۱۶۔ کیمبرج (انگلستان) کے ایام

۱۷۔ کیمبرج (انگلستان) کے ایام

۱۸۔ کیمبرج یونیورسٹی پاکستان ایسوسی ایشن پروفیسر آربری اور پروفیسر حیدری کے ساتھ

۱۹۔ کیمبرج یونیورسٹی پاکستان ایسوسی ایشن ڈاکٹر عبدالسلام، داؤد رہبر، اعجاز بٹالوی، ڈاکٹر یعقوب ہائی کمشنر حبیب رحمت اللہ اور ان کی بیگم کے ساتھ ۱۹۵۱ء

۲۰۔ انڈیا پاکستان سوسائٹی کا ڈنر

۲۱۔ بی بی سی میں کیمبرج لیٹر پڑھتے ہوئے ۱۹۵۲ء

۲۲۔ ۱۹۵۷ء درویشوں کے ساتھ بشیر احمد، بخاری، بھائی مختار، میں اور شمیم، میرا شوفر فیض پیچھے صوفہ پر بیٹھا ہے

۲۳۔ یوم اقبال کے اجلاس میں سامعین کا ایک حصہ

۲۴۔ اے ٹی ایم مصطفیٰ سمیت یوم اقبال کے مقررین منیرہ صلاح الدین کی دعوت پر

۲۵۔ انڈونیشی صدر سوئیکارنو سے ملاقات لاہور گورنر ہاؤس میں

۲۶۔ ستمبر ۱۹۶۰ء بھٹو کے ساتھ اتاترک کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے

۲۷۔ بھٹو کے ساتھ انقرہ میں

۲۸۔ یواین کے اجلاس میں سر ظفر اللہ خان کے متبادل کے طور پر ۱۹۶۱ء

۲۹۔ ۱۹۶۲ء یواین جنرل اسمبلی سے فلسطین کے مسئلہ پر خطاب کرتے ہوئے

۳۰۔ مغربی جرمنی کی کیرولاوی مہوف یواین او کے حقوق انسانی کے کمیشن کی ممبر

۳۱۔ ۱۹۶۲ء یواین ناصرہ نیویارک میں جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی

۳۲۔ ۱۹۶۳ء چواین لائی کے ساتھ ملاقات پیکنگ (چین) میں

۳۳۔ ۱۹۷۲ء حلف لینے کے بعد جسٹس سعود جان جسٹس آفتاب حسین اور چیف جسٹس سردار محمد اقبال کے ساتھ پیچھے جسٹس گلباز خان کھڑے ہیں

۳۴۔ ۱۹۷۷ء دہلی میں اندرا گاندھی کے ساتھ علامہ اقبال کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر

۳۵۔ ۱۹۷۷ء دہلی میں جناب واجپائی کے ساتھ جو اس زمانہ میں بھارت کے فارن منسٹر تھے

۳۶۔ ۱۹۷۷ء دہلی نظام الدین اولیاء کے مزار پر خواجہ حسن نظامی ثانی کے ساتھ

۳۷۔ ۱۹۷۷ء دہلی مرزا غالب کی قبر پر فاتحہ کہنے کے بعد

۳۸۔ ۱۹۷۷ء دہلی نظام الدین اولیاء کے مزار پر تصویر میں گوپی چند نارنگ اور سرجیت سنگھ لانباو خواجہ حسن نظامی ثانی بھی موجود ہیں

۳۹۔ ٹیکساس (امریکہ) بوسٹن میں اسلام پر کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ساتھ پرنس سعود الفیصل بیٹھے ہیں

۴۰۔ ٹیکساس (امریکہ) کانفرنس کے شرکاء

۴۱۔ ٹیکساس (امریکہ) کانفرنس میں بن بیلا کے ساتھ جو الجیریا کے قائد تھے اور اپنے ملک کو فرانس سے آزادی دلائی

۴۲۔ بن بیلا اپنی بیگم کے ساتھ جنہوں نے انہیں علامہ اقبال کے کلام (فرانسیسی ترجمے سے) متعارف کرایا

۴۳۔ استنبول مجلس تحفظ میراث اسلام کی صدارت کرتے ہوئے۔

۴۴۔ الریاض (سعودی عرب) مجلس تحفظ میراث اسلام سعودی وزیر ثقافت اور سفیر پاکستان کے ساتھ

۴۵۔ لاہور پیپسی سدھوا کے ناول کروایٹرز'' کا افتتاح کرتے ہوئے۔

۴۶۔ کراچی۔ پارسی کمیونٹی نے میری عزت افزائی کی

۴۷۔ کراچی۔الہ آباد ایسوسی ایشن کی میٹنگ پر مولوی مشتاق حسین اور شریف الدین پیرزادہ کے ساتھ

۴۸۔ تہران سید جمال الدین افغانی کانگرس کی صدارت کرتے ہوئے

۴۹۔ ایران۔فردوسی کے مزار پر

۵۰۔ استنبول۔علامہ اقبال پر کتب کی نمائش جناب انعام الحق سفیر پاکستان و پروفیسر رفیع الدین ہاشمی بھی موجود ہیں

۵۱۔ استنبول۔سٹریٹیجک سٹڈیز کے اجلاس میں ترکی اور پاکستان کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے

۵۲۔ اجلاس میں ماہرین کے سوال اور جواب کا سیشن

۵۳۔ انقرہ۔سٹریٹیجک سٹڈیز کا اجلاس

۵۴۔ انقرہ ترکی کے لیڈروں کے ساتھ میں اور سفیر پاکستان شیخ الطاف

۵۵۔ قونیہ،مولانا رومی کے مزار کے باہر شہر کے قائدین کے ساتھ

۵۶۔ قونیہ،مولانا رومی کے مزار کا داخلہ

۵۷۔ قونیہ،مولانا رومی کے مزار سے ملحق عجائب گھر میں مثنوی رومی کا سب سے قدیم نسخہ دیکھ رہے ہیں

۵۸۔ قونیہ،مولانا رومی کے مزار کے احاطے میں تربتِ اقبال

۵۹۔ ریکٹر کے روبرو پیش کیا جا رہا ہے

۶۰۔ ریکٹر اعزازی ڈگری دے کر گاؤن پہنا رہا ہیں

۶۱۔ امریکہ پان سلونیا یونیورسٹی میں یوم اقبال کی تقریب میرے ساتھ پروفیسر حفیظ ملک ڈاکٹر این میری شمل اور سفیر یواین اقبال اوخند بیٹھے ہیں۔

۶۲۔ امریکہ۔ولانوا یونیورسٹی پروفیسر حفیظ ملک اپنے کتب خانے میں

۶۳۔ سالسبرگ (آسٹریا) اسلام ریاست سازقوت کے موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے سیمینار کے ارکان یورپی ممالک کے نوجوان ڈپلومیٹ تھے۔

۶۴۔ ۱۹۸۲ء چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے لباس میں

۶۵۔ میں اور میرے رفقاء کار جج صاحبان

۶۶۔ بحیثیت گورنر پنجاب بنگلہ دیش کی ایک خواتین ڈیلی گیشن کے ساتھ سابق صدر نکسن کے ساتھ لاہور میں ان کی آمد پر

۶۷۔ ہائی کورٹ لاہور سے ریٹائرمنٹ کے موقع پر رخصت ہوتے ہوئے

۶۸۔ کینڈا پاکستان کینڈین ایسوسی ایشن کی دعوت پر کینڈا کے دورے کے دوران میرا خطاب

۶۹۔ ناصرہ کا خطاب

۷۰۔ پراگ (چیکوسلواکیہ) پروفیسر جان مارک کے ساتھ ناصرہ۔ پروفسر جان مارک نے ''جاوید نامہ'' اور ''فکر اسلامی کی تشکیل نو'' کا ترجمہ چیک زبان میں کیا ہے

۷۱۔ ماسکو (روس) ماہر غالب و اقبال پروفیسر نتاشہ پرگرینا روسی اکادمی آف سائنسز میں

۷۲۔ مسجد قرطبہ (سپین) میں علامہ اقبال پر یورپ میں پچھلی صدی کی سب سے بڑی کانگریس کا افتتاح کرتے ہوئے اسی مقام پر ۱۹۳۱ میں علامہ اقبال نے نماز ادا کی تھی

۷۳۔ قرطبہ (سپین) چند اقبال شناسوں کے ساتھ این میری شمل، جان مارک، ڈاکٹر درانی اور بیلجیم کے مسلم پروفیسر صادق

۷۴۔ آنٹی ڈورس، جرمن خاتون جنہوں نے میری ماں کی وفات کے بعد مجھے اور منیرہ کو سنبھالا۔ منیب کو گود میں اٹھائے ہوئے فیلڈ مارشل ایوب خان نے حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں خاندان اقبال کی خدمت کے صلے میں معقول رقم ادا کی تھی۔

۷۵۔ منیب کی گریجوایشن

۷۶۔ منیب اپنے دفتر میں بحیثیت وکیل

۷۷۔ (امریکہ) ناصرہ ہارورڈ لاء سکول سے ایل ایل ایم کی ڈگری لیتے ہوئے

۷۸۔ لاہور ہائی کورٹ۔ ناصرہ بحیثیت جج حلف لیتے ہوئے چیف جسٹس ارشاد حسن خان صاحب سے

۷۹۔ ناصرہ بحیثیت جج لاہور ہائی کورٹ

۸۰۔ کابل (افغانستان) میں اور حفیظ ملک شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی قبر پر جہاں طالبان کی بندوقوں کی گولیوں کے نشانات ہیں اور ہم دونوں نے طالبان کے قوانین کا احترام کرتے ہوئے چھوڑ رکھی ہیں

۸۱۔ بارسیلونا (سپین) ۹ نومبر ۲۰۰۱ء یوم ولادت اقبال کی تقریب پر فلسفہ اقبال پر میرے لیکچر کے بعد میئر کے محل میں

۸۲۔ ولید اقبال کیمبرج یونیورسٹی (انگلینڈ) سے ایم فل کی ڈگری لیتے ہوئے۔

ان تصاویر پر سرسری نظر ڈالنے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ مختلف نوعیت کے ہیں اپنے خاندان کے اکابرین اور بیوی بچوں کی تصاویر شامل ہیں۔ اگر (آفتاب اقبال) کی ایک تصویر بھی شامل ہو جاتی تو کیا حرج تھا اس طرح اپنی ملازمت اور شوق معاصرین اور معاصر احوال کے حوالے سے بھی کچھ تصاویر ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ تصاویر کوئی زیادہ خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتیں جیسا کہ پہلے بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ اردو میں تصاویر کی کثیر شمولیت کے ساتھ یہ منفرد نوعیت کی سوانح عمری ہے۔ گزشتہ سالوں میں اردو کی معروف ادیبہ قرۃ العین حیدر کی سوانح عمری "کار جہاں دراز" ہے شائع ہوئی۔ اس کے کچھ سال بعد انہوں نے اپنے حوالے سے تصاویر کا ایک جداگانہ مجموعہ "کفِ گل فروش" کے نام سے شائع کیا بہتر ہوتا اگر جاوید اقبال بھی تصاویر والے حصے کو علیحدہ ایک مجموعے Javed Iqbal in Pictures "جاوید اقبال تصاویر کے آئینے" میں شائع کر دیتے۔

افکارِ اقبال سے متعلق سنجیدہ خیالات و مسائل کے ساتھ اتنی کثرت (قریباً کتاب کا ایک چوتھائی سے زائد حصہ) نمائشیت، نرگسیت، شہرت و نام آوری کے کئی ایسے اندیشوں کو جنم دیتا ہے جو سوانح عمری کی سنجیدہ روایات کے منافی ہیں۔ اس میں گلیمر کتاب کی ضخامت، فروخت کتاب کی دل آویز گنجائش کا خیال زیادہ ہے دوسرا خط اور خود کلامی کے بعد یہ تصاویر دینا جسم اور مادے کے انہی رجحانات کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں جن سے بچنے کی علامہ نے تلقین کی ہے یہاں سوانح

عمری میں ایک حوالے سے ہلکا سا معنوی تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اشعار:

جاوید اقبال نے ''اپنا گریباں چاک'' میں جگہ جگہ اظہار واقعات کے ضمن میں اشعار کا استعمال کیا ہے اشعار کے استعمال میں انہوں نے دو طریقے برتے ہیں ایک تو یہ کہ اکثر ابواب کے شروع میں علامہ اقبال کے شعر دیئے ہیں دوسرے یہ کہ واقعات و احوال کے بیان کے دوران میں موقع و محل کی مناسبت سے اشعار استعمال کئے ہیں۔

جاوید اقبال کے انتخاب اشعار میں ایک سلیقہ اور قرینہ ملتا ہے۔ انہوں نے شعر برائے شعر نہیں دیئے بلکہ ہر جگہ واقعات کو آگے بڑھانے میں ان اشعار کا سہارا لیا ہے۔ یہاں ان اشعار کی صرف نشاندہی کی جا رہی ہے اگر موقع محل کے حوالے سے ان کے استعمال میں پوشیدہ مفاہیم کی گرہ کشائی کی جائے تو اس کے لئے ایک جداگانہ مقالہ درکار ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔ یہاں جاوید اقبال علامہ اقبال سے کیسے متاثر ہیں؟ اس کا اندازہ ان شعروں سے ہوتا ہے۔

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی ، مقام نغمہ تازی
نگاہ آلودہ، انداز افرنگ
طبیعت غزنوی، قسمت ایازی
ص ۶۴

چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروے
تپد آں زماں دل من، پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جوئیم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزل نہ دارم ، کہ بہ میرم از قرارے
ص ۸۳

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں
ص۹۶

اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری
خداوند یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے، سلطانی بھی عیّاری
ص۱۳۲

اے حرمِ قرطبہ ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں ،آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں!
کونسی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!
ص۱۵۹

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اِسی سے ، تری آبرو اِسی سے
جو رہی خودی تو شاہی ، نہ رہی تو روسیاہی
ص۱۶۷

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
ص۱۷۰

دین ہو ، فلسفہ ہو ، فقر ہو ، سلطانی ہو،
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر!
حرف اس قوم کا بے سوز عقل زار و زبوں
ہوگیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر
ص۱۹۶

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک
ص۲۱۲

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہیں تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
ص۲۱۵

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں
(غالب)ص۲۱۵

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی خوابیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ اُن کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں اُن کی اِس مرقد سے میں
ص۲۲۲،۲۲۳

حرفِ جاں کُن گفتۂ خیر البشرؐ
ہست شیطاں از جماعت دُور تر
ص۲۳۳

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہُوا مغربیوں کا جہاں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خُدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

ص۲۵۱،۲۵۲

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

ص۲۵۶

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

(غالب) ص۲۶۷

زمانے کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تو باقی فسانہ!
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ!

ص۲۷۴

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمدؒ ایں چہ بوالعجبی است
سرُود برسر منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر، ز مقامِ محمدؐ عربی است

ص۲۷۵،۲۷۶

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں
در بدن غرق است و کم داند ز جاں
چو بدن از قحطِ جاں ارزاں شود
مردِ حق در خویشتن پنہاں شود
در نیابد جستجو آں مرد را
گرچہ بیند رُوبرُو آں مرد را
تو مگر ذوق طلب از کف مدہ
گرچہ درکارِ تو افتد صد گرہ

ص۲۸۴

حوالہ جات

(الف)

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''زندہ رود'' جلد دوم (لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۸۳ء) ص ۳۰۷

۲۔ وحید الدین فقیر سید ''روزگار فقیر'' جلد اول (لاہور: آتش فشاں پبلی کیشنز ۱۹۸۸ء) ص ۴۷۸

۳۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''زندہ رود'' جلد سوم (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۸۴ء) ص ۴۷۸

۴۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر ''مئے لالہ فام'' (لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۲ء) ص ۲۴

۵۔ ایضاً، ص ۱۶

۶۔ ایضاً، ص ۲۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۱

(ب)

۱۔ شاہ علی سید، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری (کراچی: گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء) ص ۱۳

۲۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سیّد، آپ بیتی مشمولہ نقوش ''آپ بیتی''، نمبر، محمد طفیل (مدیر)، ۱۰۰واں شمارہ (لاہور: ادارہ فروغ اردو جون ۱۹۲۴ء)، ص ۶۱

۳۔ احتشام حسین سید، تنقیدی جائزے (لکھنو: احباب پبلشرز ۱۹۵۶ء) ص ۱۴۶، ۱۴۷

۴۔ محمد عبداللہ قریشی، ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' (لاہور مجلسِ ترقی اَدب، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۳ تا ۲۵

(ج)

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک''، (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۴ء) ص ۳

۲۔ ایضاً، ص ۴

۳۔ ایضاً، ص

۴۔ ایضاً، ص ۶

۵۔ ایضاً، ص ۷

۶۔ ایضاً، ص ۸

۷۔ ایضاً، ص ۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۰

۹۔ ایضاً، ص ۸

۱۰۔ کلیات اقبال، اردو (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۷ء)

☆☆☆

باب دوم:

جاوید اقبال کی ابتدائی زندگی کا تحقیقی توضیحی مطالعہ

جنم پتری سے اپنے آپ کی تلاش تک:

جاوید اقبال نے ''اپنا گریباں چاک'' میں اپنی خودنوشت سوانح حیات کو چھوٹے چھوٹے ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے ابواب سوانحی احوال ہیں جو مل کر ایک بڑی سوانح عمری کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ترتیب کے مطابق ہم انہیں چار پانچ بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں!

۱۔ ''جنم پتری سے اپنے آپ کی تلاش'' یعنی پہلے باب سے چوتھے باب تک اس حصۂ کتاب میں اولین زندگی کے واقعات شامل ہیں۔

۲۔ ''انگلستان سے خانہ آبادی'' یعنی پانچویں باب سے ساتویں باب تک ان ابواب میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جاوید اقبال کی انگلینڈ روانگی اور ان کی شادی تک کے واقعات ہیں۔

۳۔ ''عدل گستری سے عدالت عظمیٰ کے تین برس'' یعنی آٹھویں باب سے دسویں باب تک کتاب کا یہ حصہ جاوید اقبال کی ملازمت اعلیٰ عدالت سے وابستگی اور بحیثیت جسٹس ان کی کارکردگی کے احوال وواقعات پر مشتمل ہے۔

۴۔ ''مستقبل کی تعمیر سے خود کلامی'' یعنی گیارہویں باب سے تیرہویں باب اور اختتامیہ یعنی خود کلامی تک کے یہ ابواب جاوید اقبال کے فکرِ خیالات، تہذیب وتمدن، الہایات، سیاست وروحانیات وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر پہلے تین حصے ''پہلے باب سے دسویں باب تک'' ان کی جسمانی ساخت پر ساخت نشوونما اور کاروبار حیات کا ذکر ہے تو بعد کا حصہ ان کے افکار پر مشتمل ہے۔ ہم ''اپنا گریباں چاک'' کے تنقیدی وتحقیقی جائزے کے لئے پہلے ان کی زندگی کے ابتدائی حصے پر گفتگو کریں گے۔

۵۔ پہلے باب ''جنم پتری'' سے چوتھے باب ''اپنے آپ کی تلاش تک'' کے پہلے چار ابواب جاوید اقبال کے ''سفرِ انگلستان'' اعلیٰ تعلیم کی روانگی سے قبل کے سوانحی حالات پر مشتمل ہیں۔

جاوید اقبال کی سوانح عمری کا پہلا فقرہ ہی چونکا دینے والا اور عام سوانح عمریوں سے مختلف ہے وہ لکھتے ہیں

''اپنی پیدائش کے عمل کو کوئی دیکھ نہیں سکتا اس بارے میں خبر پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔''(۱)

یہ فقرہ ان کے مزاج کی بے باکی، شگفتگی اور کھلے ڈھلے اظہار کی نشاندہی کرتا ہے اردو زبان وادب میں سینکڑوں آپ بیتیاں موجود ہیں لیکن کسی کا آغاز بھی ایسے بے باکانہ اظہار سے نہیں ہوا۔ قاری آغاز مطالعہ ہی میں مصنف کی بے باکی سے متاثر ہوتا ہے اور ایسے طرز اظہار پر مصنف کے اظہار کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہے۔

پہلے باب کے مطالعے سے ہی جاوید اقبال کے ذہن میں موجود وہ خیالات سامنے آجاتے ہیں جو اُن کی ذات کی برتری کے حوالے سے ہیں۔ اگر چہ وہ جنم پتری پہ یقین نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود اپنی جنم پتری کے حوالے سے مختلف جواز پیش کرتے ہیں:

''شاید جنم پتری یہ معلوم کرنے کے لیے بنوائی گئی کہ اُن کا یہ بیٹا اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں کوئی نمایاں کردار ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے یا نہیں''(۲)

جنم پتری کے باب میں انہوں نے اپنی پیدائش (۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ کی شب ۹ بج کر ۳۰ منٹ بمقام سیالکوٹ) کے بعد ایک معروف نجومی بی آر سرنیواسیہ کی بنائی ہوئی جنم پتری کا ذکر کیا ہے جو جاوید اقبال کی پیدائش کے قریباً ساڑھے تین سال بعد مکمل ہوئی۔ اس جنم پتری سے جہاں جاوید اقبال کے بارے میں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ وہاں علامہ اقبال کی ذوق ستارہ شناسی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ جنم پتری بنانے کے لئے کتنا اہتمام کیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ جاوید اقبال نے اپنے احوال کے ذکر میں جنم پتری کو اہمیت دی ہے جنم پتری سے اپنا گریباں چاک کا آغاز ہوتا ہے یہ جاوید اقبال کی سوانح عمری کا پہلا باب ہے جس میں انہوں نے اپنی پیدائش اور زندگی کے ابتدائی دنوں کی بات کی ہے بقول ان کے۔

''میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کی شب ۹ بج کر ۳۰ منٹ پر سیالکوٹ شہر میں پیدا ہوا۔ اتنی تفصیل کے ساتھ میری تاریخ ولادت تحریر کرنے کی ایک معقول وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میرے

والد کے ایک ہندو دوست راجہ سرنریندر ناتھ نے انہیں میری جنم پتری بنوانے کی صلاح دی اور اس سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کیں کیونکہ وہ خود بھی جوتش یا ستارہ شناسی کے علم میں دلچسپی رکھتے تھے شاید اسی پس منظر میں میرے والد نے میری ولادت کی تاریخ کے ساتھ صحیح وقت کی تفصیل بھی انہیں مہیا کردی۔'' (۳)

یہی عبارت ''جنم پتری'' کے باب کا سبب بنی۔ انگریزی زبان میں جاوید اقبال کے بارے میں مستقبل کی پیشن گوئیوں پر مشتمل جنم پتری کے بعض مندرجات کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے جس میں اٹھائیس برس کی عمر میں جاوید کے کسی محمڈن ریاست کا چیف منسٹر بننے کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔

جاوید اقبال نے علامہ اقبال کے معروف شعر کے حوالے سے علامہ اقبال کی طرف سے اپنی جنم پتری بنوانے پر حیرت کا اظہار کیا ہے بقول ان کے

''میرے والد، انسانی خودی کے استحکام کے داعی اور جبریت کے شدید مخالف ہونے کی حیثیت سے، میری جنم پتری بنوانے پر رضامند کیسے ہوگئے؟ انہوں نے تو فرمارکھا ہے

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

"(۴)

اس سوال کے جواب میں انہوں نے اپنے سوتیلے بھائی آفتاب کے اقبال سے تعلقات کی ناخوشگوار نوعیت کے ساتھ اپنی سوتیلی والدہ اور ان کی اولاد معراج بیگم اور آفتاب اقبال کا ذکر کیا ہے۔ جس میں انہوں نے آفتاب کی پیدائش (۱۸۹۸) اور وفات ۱۹۷۹ کے ذکر کے ساتھ اس کشیدگی کی نشاندہی بھی کی ہے جو علامہ اقبال کی پہلی بیوی معراج بیگم کی علیحدگی کے بعد آفتاب اور علامہ اقبال میں بقول جاوید اقبال:

''باپ بیٹے میں اختلاف کا سبب زوجین کی علیحدگی ہوسکتی ہے کیونکہ ایسے حالات میں

بچے عموماً ماں کا ساتھ دیتے ہیں۔''(۵)

راقمہ نے جب پہلی بیوی اور آفتاب کے ساتھ تعلقات کے بارے میں وضاحت چاہی تو انہوں نے اس کا جواب اس انداز میں دیا کہ:

''پہلی بیوی سے اس لئے نہیں بنی تھی کہ وہ بہت امیر گھرانے سے تھیں یعنی گجرات میں ان کے والد وائسرائے کے سپیشل ڈاکٹر تھے اور بڑی حویلی کی پیداوار تھے اور یہ بے چارے اقبال غریب لوگ لوئر مڈل سے ان کا تعلق تھا۔ اقبال کی شکل اچھی تھی شاید اس وجہ سے رشتہ طے پایا۔

پہلی شادی اس لئے ختم ہوئی کہ امیر گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے نبھ نہ سکی۔ بھائی کے خرچ پر تو یہ پڑھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ سولہ سال کی عمر میں شادی کروادی گئی۔

معاشی طور پر دونوں خاندانوں میں تفاوت تھا تو یہ رشتہ کیسے طے ہو گیا۔؟

ہمیں اس کے متعلق بھی پوری معلومات نہیں ہیں لیکن اقبال امتحان دینے کے لئے گجرات سنٹر میں گئے تو ان کے خاندان کے کسی فرد نے ان کو دیکھا۔ شکل وصورت سے متاثر ہو کر یہ رشتہ طے پایا۔ تین سال کا عمروں کا فرق تھا۔ ان کا سیالکوٹ والے گھر میں رہنا کافی مشکل تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں پورا گھر بنا بھی نہیں تھا۔ یہ بے چارے تو کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ دو کمرے تھے۔ شادی کے بعد ایف اے تک وہیں رہے۔ دو بچے پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد آپ لاہور آ گئے تعلیم کے لئے۔ لاہور میں یہ ہوسٹل میں تھے اور وہ وہاں رہتی نہیں تھیں۔ وہ اپنے والد کے گھر چلی جاتی تھیں پھر وہ تعلق نہیں رہا۔''

انہوں نے اپنے اور منیرہ کے ساتھ آفتاب کے خوشگوار تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''انہوں نے (آفتاب نے) کراچی میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ اس لئے جب کبھی

لاہور آتے تو ان سے ملاقات ہو جایا کرتی۔''(۶)

جاوید اقبال کی زندگی کا پہلا اہم واقعہ دس برس کی عمر ۲۹ جون ۱۹۳۴ء میں علامہ اقبال کے ساتھ سرہند شریف کا سفر ہے جہاں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کا مزار مبارک ہے جو سولہویں صدی عیسوی کے معروف نقشبندی صوفی تھے یہ سفر بقول جاوید اقبال علامہ اقبال کی ایک منت کے حوالے سے تھا وہ لکھتے ہیں۔

''میری ولادت سے کچھ ماہ پیشتر میرے والد سرہند تشریف لے گئے شیخ احمد کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد نرینہ سے نوازا تو اسے ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہونگے۔''(۷)

مزار پر جانے کا واقعہ کچھ اس انداز میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''مجھے خوب یاد ہے کہ میں ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہوا۔ گنبد کے تیرہ و تار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر دی تھی۔ میرے والد تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے پاس بٹھا لیا پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہ تھا گنبد کی تاریک فضا میں ان کی رندھی ہوئی مدہم آواز گونج رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔''(۸)

''اپنا گریباں چاک'' میں جاوید اقبال کی نثر کا یہ پہلا نمونہ ہے جس میں انہوں نے چند فقروں میں فضا بندی کی ہے۔ گنبد کے اندر مزار کے قریب کی فضا بندی میں علامہ اقبال کا کردار ایک ڈرامائی شخصیت کے طور پر ابھرتا ہے اور قارئین کو متاثر کرتا ہے۔ یہ چند سطریں جن کا خمیر ایک حقیقی واقعے سے اٹھایا ہے بیان سے آگے کی تخلیقی نثر کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

جاوید اقبال نے اسی ابتدائی باب میں اپنے ایک خواب کا ذکر بھی کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں سرہند میں شیخ احمد کے مزار کی دیوار کو ہاتھوں سے تھامے زار و قطار رو رہا

ہوں۔"(۹)

اس کی تعبیر کرتے ہوئے شیخ بشیر احمد مرحوم (جو علامہ اقبال کی وفات کے کچھ عرصے کے لئے جاوید اور منیرہ کے گارڈین مقرر ہوئے تھے) نے بتایا کہ

"حضرت صاحب کے مزار کی دیوار کو ہاتھوں سے تھامے آہ وزاری کرنے کا مطلب تو یہی ہے کہ تم پر ان کا روحانی فیض جاری وساری ہے شاید اسی سبب اپنی تمام بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود تم عصبیت کے مسلمان ہو۔"(۱۰)

اس تعبیر کی مناسبت سے اسی باب میں جاوید اقبال اپنی مذہبی عصبیت پر فخر کرتے ہوئے اپنے سال پیدائش ۱۹۲۴ء کو بھی عالم اسلام کے لئے نہایت اہم سال سمجھتے ہیں۔ ترکی میں خلافت کا خاتمہ عالم اسلام کے مختلف ملکوں میں قومی ریاست یا نیشن سٹیٹ کا قیام اسی زمانے میں ہوا برصغیر پاک وہند میں دیگر ملکوں کی طرح مسلم قومی شناخت کی بنیاد پر حق خودارادیت کے حصول کی تگ و دو مسلم اکثریتی صوبوں سرحد اور بلوچستان میں دستوری اصلاحات کا نفاذ مسلم اکثریتی صوبہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی یہ سب کچھ اسی زمانے اسی سال ہوا جنم پتری سے شروع ہونے والے باب کو جاوید اقبال اپنے سال ولادت کے حوالے سے یوں ختم کرتے ہیں۔

"پس میں اپنے سال ولادت کو احیائے اسلام کی ابتداء کا سال سمجھتا ہوں، جب اندھی تقلید اور تنگ نظری کے بندھنوں سے آزاد ہو کر مذہبی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور قانونی سطح پر اجتہاد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے، اسلام کی ایک روشن خیال وسیع النظر کشادہ دل اور روادار تعبیر نے جنم لیا۔"(۱۱)

اس باب کے آخری مختصر سے پیراگراف میں جاوید اقبال نے اپنے اپنی بہن منیرہ اور بھائی آفتاب کے ناموں کے حوالے سے بعض انکشافات کئے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے والد نے ایک خواب دیکھا۔

خواب ہی کے عالم میں ان کے روبرو کسی نے قرآنی آیت پڑھی جس میں شمس، قمر اور منیر کا ذکر آتا ہے چنانچہ اس خواب کی نسبت سے انہوں نے میرے بڑے بھائی کا نام آفتاب رکھا تھا جب میں پیدا ہوا تو میرا نام

قمرالاسلام تجویز کیا مگر یہ نام میرے والد کو پسند نہ آیا انہوں نے قمرالاسلام کی بجائے میرا نام جاوید اقبال رکھا دوسرے باب چند ابتدائی سال دس صفحات پر مشتمل ہے۔ جاوید اقبال نے اس باب میں اپنی والدہ سردار بیگم کے ساتھ گزرے ہوئے چند سالوں کا مختصر ذکر کیا ہے۔ بچپن کی تین چار یادیں والدہ کے حوالے سے ان کے ذہن میں محفوظ ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی والدہ کے ساتھ ہوش وحواس کی عمر کے صرف چھ سال ہی گزارے ہیں۔

اسی باب میں انہوں نے میکلوڈ روڈ کی رہائش میں گزرے ہوئے دنوں کو دہرایا ہے۔ ہمیں علامہ اقبال کی اس رہائش گاہ کے بارے میں بعض اہم معلومات ملتی ہیں، مثلاً یہ کہ اس زمانے میں یہ کوٹھی چند ہندو یتیم بچوں کی ملکیت تھی اور میرے والد نے ان کے ولی سے کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اس کی مشرق کی سمت چھوٹا سا قبرستان تھا جس کے ساتھ پارسی سیٹھ سدھوا کے ایکسیلسیئر ہوٹل کی سہ منزلہ عمارت تھی۔ مغرب کی طرف نہال چند کی کوٹھی تھی۔ شمال میں ایک چھوٹے سے گھر میں کوئی ہندو خاندان مقیم تھا۔ دوسرے حصہ میں ایک مسلم بیوہ رہتی تھیں اور تیسرے حصہ میں غریب نومسلموں (جنہیں مصلّی کہتے تھے) کا محلّہ تھا شمال مغرب میں اس گھر کی حد بندی کے پار دیال سنگھ کالج کی گراؤنڈ تھی۔

علامہ اقبال کی رہائش گاہ (۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور) کے حوالے سے یہ انتہائی اہم معلومات ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم آج سے قریباً ایک صدی پہلے کے لاہور میں ان در و دیوار کو دیکھ سکتے ہیں جن میں علامہ اقبال نے اپنی زندگی کا اہم حصہ اور جاوید اقبال نے بچپن کا زمانہ گزارا۔ کوٹھی کا داخلہ لکڑی کے چھپر کھٹ والے بڑے برآمدے کے ذریعہ تھا جس کے ایک طرف پکے فرش کا دالان تھا جہاں میرے والد سردیوں میں دن کے وقت آرام کرسی پر بیٹھ کر دھوپ سینکا کرتے تھے اور احباب کے ساتھ ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ برآمدے سے ایک بڑا دروازہ مردانہ گول کمرے میں کھلتا تھا اس کے پہلو میں غسل خانہ سے ملحق ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جو میرے والد کا ذاتی کمرہ تھا آپ سردیوں میں رات کو یہیں سوتے تھے۔

یہ تفصیلات اس باب کا اہم حصہ ہیں یہاں ہم جاوید اقبال، علامہ اقبال اور گھر کے دوسرے کرداروں کو چلتے پھرتے دیکھتے ہیں جاوید اقبال نے اپنی تحریر سے محاکات کا کام لیا ہے گھر کا نقشہ کمروں کی ترتیب اردگرد کے

لوگوں کا گھر میں آنا کئی تفصیلات ہیں جو ہمیں ملتی ہیں مثلاً:

''دالان کا پچھلا دروازہ مصلّیوں کے محلے کی جانب کھلتا تھا۔ ان کی بہو بیٹیاں میری والدہ سے قرآن شریف پڑھنے، سینا پرونا سیکھنے یا گھر کا کام کاج کرنے کی خاطر آیا کرتی تھیں۔'' (۱۲)

اس باب سے ملنے والی تفصیلات کے مطابق اقبال کے گھر میں زنان خانے میں جاوید اقبال کی والدہ کی مدد کے لیے ایک کشمیری خاتون رحمت موجود تھیں جو ان کی شادی کے موقع پر ان کے ساتھ آئی تھیں۔ اس کے علاوہ جاوید کی تایازاد بہنیں آپا عنایت اور آپا وسیمہ اور ان کے ایک بھائی مختار اپنی اپنی شادیاں ہونے تک ادھر ہی رہے۔ کبھی کبھار جاوید اقبال کے تایا شیخ عطا محمد بھی چند ہفتوں کے لیے وہاں آجاتے۔ اقبال اپنے بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ انگلستان میں انہیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کی خاطر اخراجات کا بیشتر حصہ شیخ عطا محمد نے ہی ادا کیا تھا۔

جاوید اقبال کے بچپن میں ان کے ہمجولیوں میں رستم، ہندو خاندان کے دو بھائی اوناش اور رپن، مسلم بیوہ کے چھوٹے بیٹے معین، ان کے بھتیجے نعیم اور مصلّیوں کا بچہ چاگو وغیرہ شامل تھے۔ جاوید اقبال کا جنم دن نہیں منایا جاتا تھا لیکن ان کی والدہ اس روز قربانی کا بکرا ضرور دیتی تھیں اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ جاوید اقبال ایک سفید رنگ کی بکری سے بہت مانوس تھے یہ بکری ان کی والدہ نے انہیں تحفے میں دی تھی۔ کھانا پکانے کے لیے سودا سلف علی بخش قلعہ گوجر سنگھ کے بازار سے لاتا تھا۔ جاوید اقبال کی والدہ پردہ کرتی تھیں۔ علی بخش کو ماں وڈی (جاوید اقبال کی والدہ کی ذاتی ملازمہ) کے ذریعے بتایا جاتا تھا کہ اس نے کیا لانا ہے۔ کبھی کبھار علی بخش کے ہمراہ سڑک پر جاوید اقبال کی اپنے بڑے بھائی آفتاب سے ملاقات بھی ہو جاتی۔

جب منیرہ کی ولادت ہوئی تو جاوید اقبال کی والدہ بہت پریشان ہوئیں کہ اس کی شادی کس سے ہوگی اقبال کو تو اس کے لیے کوئی بر پسند ہی نہیں آئے گا۔ جاوید کی والدہ نے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ قرآن شریف پڑھ سکتی تھیں۔ انگریزی سیکھنے کی کوشش بھی کرتی تھیں لیکن ایک ضعیف الاعتقاد خاتون تھیں۔ ماہِ رمضان میں گھر کی تمام خواتین باقاعدگی سے روزے رکھتیں اور قرآن شریف کی تلاوت کرتیں۔ گھر کے ملازم بھی روزے رکھتے البتہ

اقبال شاذ و نادر ہی روزہ رکھتے تھے اور جب کبھی رکھتے تو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد علی بخش کو بلوا کر پوچھتے کہ افطاری میں کتنا وقت باقی ہے۔ عید کا چاند دکھائی دیتا تو گھر میں بڑی چہل پہل ہوتی۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''مَیں عموماً والد کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ گو مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی لیکن اس شب گرم پانی سے والدہ نہلاتیں اور مَیں بڑے شوق سے نہاتا۔ نئے کپڑے یا جوتوں کا جوڑا سرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے' عیدی ملتی' کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے' مجھے والدہ پہنایا کرتیں۔ سر پر تلّے کی گول مخملی ٹوپی پہنتا اور کلائی پر باندھنے کے لیے مجھے ایک سونے کی گھڑی بھی دی جاتی جو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے مجھے تحفہ کے طور پر بھیجی تھی۔'' (۱۳)

تہواروں کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ جاوید کے گھر میں عید جوش و خروش سے منائی جاتی اور عید والے دن ان کی والدہ خوبصورت شیروانی پہناتیں اور سر پر تلے والی ٹوپی اور سونے کی گھڑی بھی پہنائی جاتی جو کہ نادر شاہ نے ان کو تحفے میں بھیجی تھی۔ عید کی نماز پڑھنے کے بعد علامہ کچھ وقت میاں نظام الدین کی حویلی میں گزارتے جاوید کا سارا دن کھیلنے میں گزرتا۔ بسنت بھی خوب جوش و خروش سے منائی جاتی اور وہ رات کو پتنگ اور ڈور سرہانے رکھ کر سوتے اور صبح سے لے کر رات تک پتنگ بازی کرتے۔ اپنی معاشرتی زندگی کے بیان میں انہوں نے جزئیات نگاری کو اہمیت دی ہے اور چھوٹے چھوٹے انسانی رویّوں کو جو اس زندگی کا معمول بن گئے تھے نمایاں طور سے پیش کیا ہے۔ اس طرح شعوری کوشش سے اس دور کی زندگی کے بہت سے پہلو محفوظ ہو گئے ہیں۔ بسنت کا دن منانے کے لیے بھی جاوید اقبال کی فرمائش پر خوب اہتمام کیا جاتا۔ سارا دن پتنگیں اڑانے اور پیچ لڑانے میں گزرتا۔ شب برات پہ پٹاخے خرید کر چلانے کے لیے بھی والدہ سے پیسے ملتے۔

جاوید اقبال کو سیکرڈ ہارٹ مشنری سکول میں داخل کیا گیا۔ وہاں لڑکیوں کے ساتھ پڑھائی ہوتی تھی۔ اس وقت جاوید اقبال کی عمر ساڑھے پانچ برس تھی۔ جاوید بچپن میں بہت شریر تھے' والدہ سے مار کھانا ان کا معمول تھا۔ ان کی والدہ نرم دل اور حلیم طبع تھیں لیکن بچوں کی پرورش کے حوالے سے انہیں کسی قسم کی کوتاہی گوارا نہیں تھی۔ اقبال

بچوں کو بہت کم مارتے تھے۔ان کی ڈانٹ یا جھڑک ہی کافی ہوتی تھی۔جب کبھی برہم ہوتے تو ان کے منہ سے یہی الفاظ نکلتے''احمق آدمی!بے وقوف''۔ناراض ہوتے تو پنجابی کی بجائے اردو یا انگریزی میں غصہ کا اظہار کرتے۔جاوید کی والدہ بچوں کو خود تو مار لیتیں لیکن کسی اور کو ہاتھ اٹھانے نہ دیتی تھیں۔جاوید اقبال لکھتے ہیں

''ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ والد نے کسی شرارت پر مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن والدہ بیچ میں آ کھڑی ہوئیں اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔والد نے دوسرا ہاتھ اٹھایا تو والدہ نے وہ بھی پکڑ لیا۔اس دوران میں تو خوف کے مارے نیچے بیٹھا والدہ کی ٹانگ سے چمٹا رہا لیکن وہ دونوں اس عجیب صورت حال پر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔''(۱۴)

جاوید اقبال کی زندگی کے ابتدائی سال کے حوالے سے بہت سی معلومات ان کے اچھے حافظے کی عطا ہیں۔وہ اپنے گھر،رشتہ داروں اور احباب کے حوالے سے معلومات فراہم کرتے ہوئے بہت حد تک اپنی یادداشت پر بھروسہ کرتے ہیں اور اکثر مقامات پر اس امر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔درج ذیل اقتباس دیکھیے:

''میری ولادت تو ہمارے سیالکوٹ کے آبائی گھر میں ہوئی لیکن اگر مَیں اپنی یادداشت کو پیچھے لے جاؤں تو میری نگاہوں میں لاہور کی وہ کوٹھی ابھرتی ہے جہاں مَیں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔(۱۱۶۔میکلوڈ روڈ،جو اَب محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے)اس زمانہ میں یہ کوٹھی چند ہندو یتیم بچوں کی ملکیت تھی اور میرے والد نے ان کے ولی سے کرایہ پر لے رکھی تھی۔کوٹھی کا حدود اربعہ کچھ اس طرح تھا۔گھر میکلوڈ روڈ سے قدرے پیچھے ہٹ کر بنا تھا۔اس کی مشرق کی سمت چھوٹا سا قبرستان تھا جس کے ساتھ پارسی سیٹھ سدھوا کے ایکسلسیر ہوٹل کی سہ منزلہ عمارت تھی۔مغرب کی طرف ڈاکٹر نہال چند کی کوٹھی تھی۔شمال میں ایک چھوٹے سے گھر میں کوئی ہندو خاندان مقیم تھا۔دوسرے حصہ میں ایک مسلم بیوہ رہتی تھیں اور تیسرے حصہ میں غریب نومسلموں(جنہیں مصلّی کہتے تھے)کا محلّہ تھا۔شمال

مغرب میں اِس گھر کی حد بندی کے پار دیال سنگھ کالج کی گراؤنڈ تھی۔''(۱۵)

یہ تو گھر سے باہر کی منظر کشی تھی۔گھر کی اندرونی حالت یقیناً اس دور کے فن تعمیر کی عکاسی کرتی ہے۔گھر کی اندرونی حالت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کوٹھی کا داخلہ لکڑی کے چھپر کھٹ والے برآمدے کے ذریعہ تھا جس کے ایک طرف پکے فرش کا دالان تھا۔ جہاں میرے والد سردیوں میں دن کے وقت آرام کرسی پر بیٹھ کر دھوپ سینکا کرتے تھے اور احباب کے ساتھ ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ برآمدے سے ایک بڑا دروازہ مردانہ گول کمرے میں کھلتا تھا۔اس کے پہلو میں غسلخانہ سے ملحق ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو میرے والد کا ذاتی کمرہ تھا۔آپ سردیوں میں رات کو یہیں سوتے تھے۔گول کمرے سے ایک دروازہ پچھلے کمرے میں جاتا تھا۔یہ کمرہ کوٹھی کے درمیان میں ہونے کے سبب خاصا تاریک اور ٹھنڈا تھا۔میرے والد گرمیوں میں دوپہر کو یہیں آرام کیا کرتے۔پچھلے کمرے کا ایک دروازہ زنان خانے میں کھلتا تھا۔اسی طرح بڑے برآمدے اور زنان خانے کے درمیان ایک ڈیوڑھی تھی ،جس کے ذریعے اندر جایا جاسکتا تھا۔ایک چھوٹا برآمدہ اندر بھی تھا جس کے بعد ایک وسیع دالان تھا جس میں میری والدہ، بچے اور گھر کی خواتین گرمیوں میں رات کو سوتے تھے۔دالان کی اونچی دیوار کے پرے دیال سنگھ کالج کی گراؤنڈ تھی۔دیال سنگھ کالج اس زمانے میں ایک معروف کالج تھا جو تعلیمی معیار کے اعتبار سے گورنمنٹ کالج کا مقابلہ کرتا تھا۔دالان کی جنوبی سمت باورچی خانہ اور برتن یا کپڑے دھونے کے لیے نلکا نصب تھا۔باورچی خانہ میں میری والدہ کھانا پکایا کرتی تھیں۔''(۱۶)

جاوید اقبال کو نو برس کی عمر میں سیکرڈ ہارٹ سکول سے فارغ کر دیا گیا کیونکہ اس سے بڑی عمر کے بچے لڑکیوں کے سکول میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ابتدائی تعلیم انگریزی میں ہونے کی وجہ سے انہیں لاہور کے سنٹرل ماڈل

سکول میں داخل ہونے سے پیشتر ایک سال کے لیے سینٹ فرانسس سکول انارکلی میں داخل کرایا گیا۔ وہاں انہیں ماسٹر تاراچند جیسے استاد ملے جو گھر آ کر بھی پڑھاتے تھے۔ اردو زبان میں جاوید اقبال کی دلچسپی اور اردو لکھنے میں ان کی خوشخطی ماسٹر تاراچند ہی کی بدولت ہے اور وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

معاشرتی طور پر جاوید اقبال کے خاندان کا تعلق نچلے درمیانی طبقہ سے تھا۔ ان کے والد کے خاندان کے مقابلے میں ان کی والدہ کا خاندان کم افراد پر مشتمل اور معاشی اعتبار سے زیادہ کمزور تھا۔ ان کی والدہ کے صرف ایک ہی بھائی تھے جو انہیں اور منیرہ کو بہت پیار کرتے تھے۔ ان کا نام خواجہ عبدالغنی تھا۔ دونوں بہن بھائی بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے اور انہیں ان کے پھوپھا اور پھوپھی نے پالا تھا۔ جاوید کی والدہ کے گھر کے اخراجات سے بچائے ہوئے روپوں اور ان کے زیورات کی فروخت سے اراضی خریدی گئی اور میوروڈ پر گھر کی عمارت تعمیر کی گئی۔ اس کا نقشہ شیخ عطا محمد نے بنایا تھا اور تعمیر بھی ان کی زیرنگرانی ہوئی تھی۔ اراضی اور کوٹھی جاوید منزل ان (جاوید اقبال) کی والدہ کے نام تھی۔ جاوید کی والدہ بیماری کی حالت میں نئے گھر میں آئیں۔ اقبال نے ان سے کہا کہ اس گھر کو جاوید کے نام ہبہ کر دو لیکن وہ نہ مانتی تھیں۔ بہرحال اقبال کے سمجھانے پر انہوں نے ہبہ نامے پر دستخط کر دیے اور جاوید منزل جاوید اقبال کے نام منتقل ہو گئی۔ اقبال نے ایک کرایہ نامہ بھی تحریر کیا جس کی رو سے وہ جاوید اقبال کے کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگے۔ اقبال سامنے کے تین کمروں میں رہائش کا پیشگی کرایہ ہر ماہ کی اکیس تاریخ کو ادا کرتے تھے۔

نئے گھر میں آنے کے تیسرے یا چوتھے روز جاوید کی والدہ نے وفات پائی۔ انہیں بی بی پاک دامن کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس موقع پر اقبال اس قدر مغموم تھے کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے انہیں اتنے غم میں نہ دیکھا تھا۔ بیوی کی بے وقت موت نے اقبال کو پژمردہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے دونوں بچوں کا بے حد خیال رکھنے لگے تھے۔ منیرہ کو کنیرڈ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ دونوں بچوں کو حکم تھا کہ اقبال سے مل کر سکول جایا کریں۔ اقبال جاوید کو پیار سے ببا اور منیرہ کو بی کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ وہ منیرہ کو بہت پیار کرتے تھے اور ان کی ہر خواہش بغیر کسی حیل وحجت کے پوری کرتے تھے۔ والدہ کی وفات کے بعد سب سے اہم مسئلہ گھر میں ایسی خاتون کی موجودگی کا تھا

جو دونوں بچوں بالخصوص منیرہ کی دیکھ بھال کر سکے۔ اقبال اس خیال سے جاوید کو اپنے ہمراہ سفر پر لے جاتے تھے کہ کہیں وہ ان کی غیر موجودگی میں منیرہ سے لڑتے نہ رہیں۔ اپنی بیوی کی وفات کے بعد اقبال صرف ایک بار زنان خانے میں آئے تھے وہ بھی اس وقت جب جاوید شدید زکام کی وجہ سے بستر پر تھے۔ انہوں نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا۔ جاوید اقبال نے انہیں از سر نو خضاب لگانے کو کہا تو انہوں نے خضاب لگانا شروع کر دیا لیکن چند ماہ بعد ہی پھر چھوڑ دیا اور پھر کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ انہیں دوبارہ اس کے لیے مجبور کر سکے۔

بہت کوششوں کے بعد ایک جرمن خاتون ڈورس کو بچوں کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ وہ پچاس روپے ماہوار کی تنخواہ پر علی گڑھ سے لاہور تشریف لائیں۔ ان کے آنے سے گھر میں ترتیب آ گئی اور لائف سٹائل کچھ حد تک یورپین ہو گیا۔ گھر میں سب انہیں ''آپا جان'' کہتے تھے۔ وہ جرمن کے علاوہ انگریزی اور اچھی خاصی اردو بول لیتی تھیں۔ اقبال سمیت تمام افراد خانہ دوپہر کا کھانا کھانے والے کمرے میں میز پر اکٹھے کھانے لگے۔ اقبال گھر میں دھوتی اور بنیان کی بجائے شلوار قمیض پہننے لگے۔ ڈورس جرمن کھانے پکانے کی ماہر تھیں۔ وہ جاوید اور منیرہ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتیں۔ شام کو بچوں کو سیر کرانے لے جاتیں۔ رات کا کھانا سب اکٹھے کھاتے۔ اقبال رات کا کھانا نہ کھاتے تھے صرف کشمیری چائے پیتے تھے جو انہیں ان کے کمرے میں پہنچا دی جاتی۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''آنٹی ڈورس ایک دفعہ منیرہ کے ساتھ کنیرڈ سکول گئیں تو انہیں پتا چلا کہ منیرہ کو بائبل کلاسوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اگرچہ وہ خود مسیحی عقیدہ کی تھیں' انہوں نے واپس آ کر والد سے شکایت کی کہ سکول میں منیرہ کو بائبل پڑھنا پڑتی ہے' اس لیے انہیں وہاں سے اٹھا لیا جائے۔ والد نے کہا اس میں کوئی بری بات نہیں کیونکہ منیرہ کو مختلف مذاہب کی تعلیمات کا علم ہونا چاہیے اور اگر ایسی کوئی بات ہے تو ان کے لیے گھر پر قرآن شریف پڑھانے کے لیے کسی معلّمہ کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ کوئی معقول بندوبست نہ ہو سکا' اس لیے آنٹی ڈورس نے منیرہ کو کنیرڈ سکول سے اٹھوا کر انجمن حمایتِ اسلام کے ایک

لڑکیوں کے سکول میں داخل کرادیا۔ان ایام میں اسی سکول کی تیز طرار ہیڈ مسٹرس جو نوجوان، خوبصورت اور خوش پوش خاتون تھیں، ہمارے یہاں اکثر آجایا کرتی تھیں اور فخریہ بیان کرتی تھیں کہ انہوں نے آکر انجمن سکول میں کتنی شاندار تبدیلیاں کردی ہیں مگر وہاں منیرہ کے بالوں میں جوئیں پڑ گئیں لہٰذا انہیں وہاں سے اٹھوا کر بالآخر کوئین میری سکول میں داخل کرادیا گیا۔میرے لیے تو سنٹرل ماڈل سکول جانے اور آنے کے لیے ماہانہ بنیاد پر ایک ٹانگہ کا انتظام کیا گیا تھا لیکن منیرہ کا سکول ہمارے گھر کے قریب ہی تھا، اس لیے وہ علی بخش کے ساتھ چند سہیلیوں کو رستہ میں لیتی ہوئی پیدل جایا کرتی تھیں'' (۱۷)

انٹرویو کے دوران جب راقمہ نے آنٹی ڈورس اور ان کے تعلقات کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اس کا جواب کچھ یوں دیا کہ:

''والدہ کی وفات کے بعد پہلے تو عزیز رشتہ داروں میں سے کوئی نہ کوئی رہنے آجاتا تھا۔ پھر آنٹی ڈورس مستقل طور پر آئیں۔ وہ آخری عمر تک یہیں رہیں اور فوت بھی ادھر ہی ہوئیں۔کرسمس کے موقع پر ہم جاتے ہیں ان کی قبر پر دعا کے لئے۔ان کی بہن بوٹنی کے ایک پروفیسر حیدری علی گڑھ میں بیاہی ہوئی تھیں۔ہٹلر کے زمانے میں مس ڈورس جرمنی سے ہندوستان میں اپنی بہن سے ملنے کے لئے آئی تھیں۔شادی کی تو شوہر ان کا حیدرآباد دکن میں تھا۔اس نے دوسری شادی کرلی تھی۔جرمن لاء کے تحت جس نے غیر جرمن سے شادی کی ہو تو وہ پھر اسی کے ملک میں جاکر Divorce لے تو وہ Divorce لینے کے لئے آئی تھیں۔طلاق لے کر بہن کے پاس علی گڑھ رہنے لگیں۔ جب ہمیں کوئی خاتون نہ ملیں۔ پہلے تو کبھی پھوپھیاں آتیں یا تائی وغیرہ۔منیرہ کسی سے مانوس نہیں ہوئی تھیں۔ وہ چھوٹی تھیں۔تقریباً چھ سال پہلے یہاں دیکھ بھال کے لئے کسی خاتون کو رکھنے کی کوشش کی تو وہ کہنے لگیں کہ پہلے علامہ سے شادی تو کریں گی تو وہ

ہنس کے ٹال دیتے تھے۔ اس لئے کوئی دیسی یا مسلمان خاتون نہ مل سکیں۔ اس لئے پھر مس ڈورس کو رکھا گیا۔ یہ زیادہ انگریزی ہی بولتی تھیں۔ منیرہ کی شادی اور میری شادی تک رہیں پھر جرمنی چلی گئیں وہاں پر بہت بیمار ہوگئیں تو منیرہ کو لکھا کہ آ کر لے جاؤ تو پھر منیرہ انہیں جا کر لے آئیں ان کا بیٹا ماں کے ساتھ جا کر انہیں جا کر لے آیا وہ اتنی بیمار تھیں کہ انہیں اٹھا کر لایا گیا اور سال پھر بیمار رہے کے بعد وفات پا گئیں۔"

اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سخت مزاج اور قدامت پسند ذہن کے مالک تھے۔ انہیں منیرہ کی دیکھ بھال کے لیے کسی یورپین خاتون کا انتظام بالکل پسند نہ تھا۔ اس بارے میں انہوں نے اکثر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اقبال اپنے بڑے بھائی کا بہت ادب کرتے تھے اور ان کی تمام باتوں کو خاموشی کے ساتھ سنتے تھے مگر عملی طور پر وہی کرتے تھے جو ان کا دل چاہتا تھا۔ اقبال نے اپنی زندگی میں صرف دو بار جاوید اقبال کو سینما دیکھنے کی اجازت دی۔ دونوں بار انگریزی فلموں کے لیے یہ اجازت ملی۔ ایک فلم فرانسیسی ادیب ایمائیل زولا کی حیات سے متعلق تھی اور دوسری فلم نپولین کے حالات زندگی پر مبنی تھی۔ جاوید نے دونوں فلمیں میاں محمد شفیع، ڈورس اور منیرہ کے ساتھ دیکھیں۔ اقبال اکثر اپنے بیٹے کو خالد بن ولیدؓ اور فاروقِ اعظمؓ کی باتیں سنایا کرتے۔

جاوید اقبال کو اردو ادب سے متعلق کتب اور افسانے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ انہوں نے باغ و بہار، حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبدالحلیم شرر کے ناول بڑے شوق سے پڑھے۔ ساتویں جماعت کے امتحان کے قریب ان کے ہاتھ الف لیلیٰ لگ گئی۔ وہ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ جاوید نے امتحان کی تیاری بجائے الف لیلیٰ کو فوقیت دی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ ساتویں جماعت کے امتحان میں فیل ہوگئے۔ جب اقبال کو علم ہُوا کہ وہ الف لیلیٰ میں منہمک ہونے کی وجہ سے فیل ہوئے ہیں تو انہوں نے جاوید کو ڈانٹا نہیں بلکہ فرمایا کہ اگر تم امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد الف لیلیٰ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا۔ اقبال نے اپنے بچوں کے ساتھ کشمیر جانے کا ارادہ کیا لیکن انہیں اجازت نہ مل سکی اس بارے میں جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"ایک بار گرمیوں کے موسم میں والد نے کشمیر جانے کا ارادہ بھی کیا کیونکہ ان کے احباب

کا اصرار تھا کہ وہ تبدیلی آب و ہوا کی خاطر لاہور سے تھوڑے عرصے کے لیے کہیں باہر چلے جائیں۔ انہوں نے منیرہ اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم سب بڑے خوش تھے کہ والد کے ساتھ کشمیر جا رہے ہیں لیکن کشمیر میں ان کا داخلہ ممنوع تھا' لہٰذا انہوں نے حکومت کشمیر سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عرصہ تک خط و کتابت جاری رہی مگر جب اجازت ملی تو گرمیوں کا موسم نکل چکا تھا۔ یوں وہ اپنی زندگی میں آخری بار وادیٔ کشمیر میں کچھ دن گزارنے سے محروم رہ گئے۔ اسی طرح بیت اللہ کے حج پر جانے کا قصد بھی کیا لیکن وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔'' (۱۸)

آخری ایّام میں اقبال کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی۔ جاوید اقبال کو حکم تھا کہ انہیں ہر روز صبح انقلاب یا زمیندار اخبار پڑھ کے سنایا کریں۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ہو جاتا تو اقبال بہت خفا ہوتے۔ جاوید اکثر رات کو اقبال کو دیوان علی ہارمونیم پر بلھے شاہ' سلطان باہو' وارث شاہ یا کسی اور پنجابی صوفی شاعر کا کلام گا کر سنایا کرتے۔ کبھی کبھار اقبال اپنی کوئی غزل سنانے کی فرمائش بھی کرتے تھے۔ اگر کوئی شعر غلط پڑھا جاتا تو ناراض ہو جاتے اور کہتے کہ شعر پڑھ رہے ہو یا نثر؟

ایک روز اقبال نے اپنے کمرے میں منشی طاہر الدین کے سامنے کاغذوں سے بھرا ایک ٹرنک رکھوایا اور اس میں سے چھانٹ چھانٹ کر بعض تصاویر اور کاغذات انہیں جلتی ہوئی انگیٹھی میں پھینکنے کو دیئے۔ جو کاغذات اور مسودات جلائے نہیں گئے وہ اب اقبال میوزیم کی زینت ہیں۔ اقبال کے ذاتی کاغذات میں سے وہی باقی ہیں جو انہوں نے بذاتِ خود محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے۔

۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کی رات نو بجے کے قریب جاوید اقبال اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ پہچان نہ سکے اور پوچھا کون ہے؟ جاوید نے جواب دیا ''مَیں جاوید ہوں'' ہنستے ہوئے بولے ''جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں''۔ پھر قریب بیٹھے ہوئے چودھری محمد حسین سے کہنے لگے ''اسے میرے جاوید نامہ کے آخر میں دعا ''خطاب بہ جاوید'' ضرور پڑھوا دیجیے گا'' اس رات جاوید منزل میں بہت سے ڈاکٹر آئے۔ ہر ایک ہراساں

دکھائی دے رہا تھا۔ اقبال سے ڈاکٹروں کی رائے مخفی رکھی گئی تھی مگر وہ بڑے تیز فہم تھے۔ انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ اس رات معمول سے زیادہ ہشاش بشاش تھے۔ جاوید اقبال کو اصل صورت حال سے آگاہ نہ کیا گیا۔ طلوع آفتاب کے وقت علی بخش نے چیختے ہوئے کہا جاؤ دیکھو تمہارے باپ کو کیا ہو گیا ہے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ

> ''مَیں نے دہلیز پر کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔ ان کے کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہ چارپائی پر سیدھے لیٹے تھے۔ انہیں گردن تک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی۔ والد کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ قبلہ کی جانب تھا، مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے اور سر کے بالوں کے کناروں پر میرے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی موجود تھی۔ والد کی وفات کی خبر لاہور میں آگ کی طرح پھیلی۔ صبح ہی سے لوگ جوق در جوق ان کے آخری دیدار کی خاطر جاوید منزل میں جمع ہونے لگے۔ والد کے خاندان اور شہر کی دیگر خواتین بھی آتی چلی گئیں۔ والدہ آفتاب بھی ان میں موجود تھیں۔ اسی طرح بھائی آفتاب سارا دن اپنے باپ کی پائینتی کی طرف فرش پر بیٹھے کبھی ان کے پاؤں کو چومتے اور کبھی اپنی آنکھوں سے لگاتے رہے۔'' (۱۹)

شام چار بجے کے قریب جنازہ اٹھایا گیا۔ چارپائی کو لمبے لمبے بانس باندھے گئے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ کندھا دے سکیں۔ ہزاروں لوگوں کے ساتھ جنازہ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا۔ پہلی مرتبہ نماز جنازہ وہیں پڑھی گئی۔ لاتعداد لوگ بادشاہی مسجد میں بھی جنازے کے منتظر تھے۔ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ سے جنازہ بادشاہی مسجد پہنچا وہاں بادشاہی مسجد کے خطیب صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ میت کو لکڑی کے تابوت میں رکھا گیا اور دفنانے سے پیشتر تابوت قبر کے قریب رکھ دیا گیا۔ سیالکوٹ سے شیخ عطا محمد اور دیگر عزیزوں کی آمد کے بعد میت قبر میں اتاری گئی۔ اس عمل میں رات کے دس بج گئے۔

جاوید اقبال اور منیرہ کے ولیوں کی ایک میٹنگ اقبال کے انتقال کے دوسرے روز ہوئی جس میں طے پایا کہ جاوید اور منیرہ جاوید منزل میں اسی طرح رہیں گے جیسے اقبال کی زندگی میں رہتے تھے یعنی بچوں کی دیکھ بھال ڈورس اور ماں وڈی کریں گی اور وہ معمول کے مطابق اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں گے۔ بھوپال سے اقبال کا وظیفہ ان (اقبال) کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہوگیا تھا۔ اقبال کی وفات کے بعد ان کی آخری تصنیف ''ارمغان حجاز'' چودھری محمد حسین کی زیرنگرانی شائع ہوئی۔ ولیوں میں زیادہ ذمہ داری چودھری محمد حسین اور حکیم طاہرالدین کے کندھوں پر تھی۔ اقبال کی تصانیف کے تمام نئے ایڈیشن چودھری محمد حسین کی زیرنگرانی شائع ہوتے تھے۔ آمدنی کا حساب حکیم طاہرالدین رکھتے تھے۔ وہ گھر کے ملازمین کی تنخواہوں' بچوں کے سکولوں کی فیس' گھریلو اخراجات اور انکم ٹیکس کی ادائیگی کے لیے رقوم فراہم کرتے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بقول:

> ''شیخ عطا محمد کو اس بات کا رنج تھا کہ والد نے انہیں اپنی اولاد کا ولی کیوں نہ مقرر کیا۔ میرے خیال میں والد نے ان کی سخت طبیعت اور بزرگی کے پیش نظر انہیں تکلیف نہ دی۔ تایا جی کے خاندان میں صرف بھائی اعجاز ہی تھے جنہوں نے بی اے ایل ایل بی تک اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے چچا کی طرح ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ اگرچہ والد کو بھائی اعجاز احمد کا احمدی عقیدہ اپنانا پسند نہ تھا' پھر بھی بڑے بھائی کے سب سے بڑے فرزند ہونے کی حیثیت سے انہیں محبت کرتے تھے۔'' (۲۰)

ایف اے میں جاوید اقبال کے مضامین انگریزی' عربی' جغرافیہ اور اردو تھے۔ جاوید اقبال نے بی اے (آنرز) کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ آنرز کی ڈگری جغرافیہ میں حاصل کی۔ ڈراما نویسی میں جاوید اقبال کے تجربات زیادہ تر ''اظہاریت'' کی جرمن ادبی تحریک سے وابستہ تھے۔ اس تحریک نے مغربی دنیا کے ڈراما نویسوں کو اظہار کی نئی راہیں تلاش کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ڈرامے میں کردار کی صرف ظاہری صورت ہی پیش نہ کی جائے بلکہ اس کی ایکسرے پورٹریٹ دکھائی جائے تاکہ انسان کے ظاہر و باطن کے تضاد کو واضح کیا جاسکے۔ ۱۹۴۸ء میں جاوید اقبال نے ایم اے (فلسفہ) کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں فرسٹ

پوزیشن اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

جاوید کو صرف ڈرامہ نویسی کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ موقع ملنے پر وہ ایکٹنگ سے بھی گریز نہیں کرتے تھے ۔ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں جاوید اور ان کے احباب جن میں عزیز احمد، نذیر اے سید، افضل اقبال، مظہر وغیرہ شملہ میں موجود تھے۔ جاوید نے انہیں اکسایا کہ ٹیگور کے ڈرامہ 'پوسٹ آفس'' کا اردو ترجمہ کر کے سٹیج کیا جائے۔ سب نے مل کر ''پوسٹ آفس'' کا اردو میں ترجمہ کیا اور اسے شملہ کے کالی باڑی ہال میں تین روز کے لیے سٹیج کیا گیا۔ جاوید نے اس ڈرامہ میں امل کا کردار ادا کیا۔ یہ ڈرامہ اتنا مقبول ہُوا کہ لوگوں کے اصرار پر اس کے مزید تین دن بڑھانے پڑے۔ اپنے حوالے سے جاوید اقبال کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

> ''ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ہم سب بازار حسن میں گانا سن چکنے کے بعد رات گئے لوٹ رہے تھے۔ بازار میں ہنگامہ سا تھا۔ ایک بدمعاش ٹانگہ کے کوچوان کو اسی کے چابک سے بڑی بے دردی سے پیٹ رہا تھا اور کوچوان نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ چابک کا بیت ریزہ ریزہ ہو گیا لیکن بدمعاش نے کوچوان کو نہ چھوڑا بلکہ ساتھ ہی دودھ دہی کی دکان سے ابلتے دودھ کی کڑاہی اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کوچوان کے اوپر انڈیل دی۔ اس کی چیخ و پکار سے لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ مگر یہ ظلم دیکھ کر مَیں آپے سے باہر ہو گیا۔ بدمعاش کو گریبان سے پکڑا اور پلک بھر میں دائیں ہاتھ سے ایک مکہ اس کے پیٹ پر مارا اور پھر بائیں ہاتھ سے دوسرا مکہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رسید کیا۔ بدمعاش اس اچانک حملہ سے اتنا بدحواس ہُوا کہ ناک آؤٹ ہو کر گھوڑے کے قریب کیچڑ بھری زمین پر گر گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میرے دوست سخت پریشان ہوئے۔ فوراً قریب کھڑی موٹر کار میں مجھے دھکیلا اور وہاں سے فرار ہو گئے۔ گیارہ بارہ برس گزرنے پر جب میں نے انگلستان سے ڈاکٹریٹ اور بار کے امتحان پاس کرنے کے بعد خواجہ عبدالرحیم مرحوم کے ساتھ

وکالت کا آغاز کیا تو ایک دن یہی بدمعاش صاحب خواجہ صاحب کے دفتر میں ان
کے موکل کی حیثیت سے موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ انہوں
نے جواب میں ارشاد کیا۔ ''جی! ڈاکٹر صاحب کو مَیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میرے
لیے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ مَیں نے ان کے ہاتھوں مار کھائی ہے۔'' (۲۱)

مندرجہ بالا اقتباس میں جاوید اقبال نے اپنی شخصیت کو ایک عظیم ہیرو کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس کا اثر کئی سال گزر جانے کے باوجود افراد کے ذہنوں پر باقی ہے۔ یہ اور ایسے بہت سے مقامات جاوید اقبال کی صاف گوئی کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے بازارِ حسن میں گانا سننے کے شوق سے انکار نہیں کیا بلکہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

برّصغیر کے سیاسی حالات کو اپنی آپ بیتی میں مکمل طور پر نہ سہی لیکن کئی مقامات پر شامل کر کے جاوید اقبال نے ''اپنا گریباں چاک'' کو ایک سیاسی اور تاریخی جہت عطا کی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں جب لاہور کے منٹو پارک میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو جاوید اقبال کی عمر تقریباً سولہ برس تھی اور وہ میٹرک کے طالب علم تھے۔ وہ امتحانات کی مصروفیت کے سبب منٹو پارک کے تاریخی جلسے میں شریک نہ ہو سکے۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری کی خبر بہت تیزی کے ساتھ پھیلی۔ سکولوں اور کالجوں کے طلبا نے تحریکِ پاکستان میں جوش و خروش سے حصہ لیا۔ ۱۹۴۶ء میں جاوید اقبال کے دو اہم انگریزی مضمون ''ڈان'' اخبار میں شائع ہوئے۔ ایک مضمون کا عنوان ''قائداعظم ایک عظیم انسان'' تھا جس میں جاوید اقبال نے کارلائل کے برتر انسان کے تصوّر کی روشنی میں یہ ثابت کیا تھا کہ قائداعظم کس طرح عام انسانوں سے برتر ہیں۔ دوسرا مضمون ''اسلام اور پاکستان'' کے عنوان سے تھا۔ اس میں جاوید نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ پاکستان کا تصوّر اسلام کی کسی روایتی فرقہ وارانہ تعبیر پر نہیں ہے بلکہ اصلاحی تعبیر پر قائم ہے۔ دونوں مضمون قائداعظم کی نظر سے گزرے اور انہوں نے انہیں پسند کیا۔

جب انٹرویو میں راقمہ نے ان مضامین کی وضاحت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے اس کا جواب کچھ اس ان الفاظ میں دیا کہ:

''قائداعظم کی زندگی میں Dawn میں دو مضمون انگریزی میں چھپے تھے۔ ایک کا

عنوان تھا Quaid Azam the Over mat اس وقت میں MA میں پڑھتا تھا۔ اصل میں اس زمانے میں Superman کے مقابلے میں انگریز مصنف جانسن نے Overman کا تصور دیا۔ کہ انسانوں میں بعض ایسی شخصیات پیدا ہوتی ہیں جو عام انسانوں سے بلند ہوتی ہی اور سپر مین میں نے ان کو نہیں کہا کیونکہ وہ Concept ماورائی ہے۔ میں نے اس مضمون میں ثابت کیا کہ کس طرح جناح اوور مین ہیں وہ مضامین قائد نے پڑھا اور اس کا مجھے جواب آیا۔ وہ خط بھی مجھ سے ضائع ہوگیا بہرحال اس کا ذکر شریف المجاہد نے کیا ہوا ہے اپنی کتاب میں۔ ایک مضمون اسلام اینڈ پاکستان، یہ شاید ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں لکھا۔ جب میں نے یہ لکھا تو سردار عبدالرب نشتر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا کہ جس اسلام کی بنیاد پر پاکستان بنانے کا آپ دعویٰ کر رہے ہیں وہ ''اسلام'' وہ نہیں جو علماء یا مولویوں کے وژن کا ہے۔ یہ جدت پسندی بھی میں نے Inherit کی ہے۔ اقبال کے متعلق بھی یہ الزام تھا کہ وہ جدت پسند ہیں یہ مضمون بھی قائداعظم نے بہت پسند کیا لیکن میرے پاس کوئی سند نہیں ہے کہ قائد نے یہ دونوں مضمون پسند کیے ہیں ؎

انہیں ہمیشہ سے اپنے انوکھے طرز فکر کا احساس رہا ہے۔ ندرت اور انفرادیت کا یہ احساس جاوید اقبال کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جاوید اقبال ایم اے انگریزی میں فیل ہوگئے۔ اپنی اس ناکامی کا سبب وہ ادب کے بارے میں اپنے انوکھے نقطۂ نظر کو قرار دیتے ہیں جو ہوسکتا ہے کہ ممتحن کو پسند نہ آیا ہو۔ چودھری محمد حسین نے جاوید سے کہا کہ حصول علم کے دوران تکبر کی بجائے عاجزی سے کام لینا چاہیے۔ اس کے بعد جاوید نے ایم اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ پھر بغیر کسی تیاری کے ایم اے انگریزی کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگئے۔ بعدازاں ان کی تمام تر توجہ فلسفہ کی طرف مبذول ہوگئی۔

ہجرت کے واقعات نے برصغیر کے مسلمانوں پر جو اثرات مرتب کیے اُن کا دکھ جاوید اقبال کی آپ بیتی میں موجود

ہے۔ان کا دل آزادی کا جشن منانے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی تذلیل پر بھی آنسو بہاتا تھا۔ یہ ایک فرد کے احساسات اور جذبات نہیں بلکہ پوری قوم کے باشعور اور حساس انسانوں کا طرزِ فکر ہے جو جاوید اقبال کی تحریر میں سامنے آیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ انفرادیت کے دائرے سے نکل کر اجتماعیت سے ہم کلام ہو رہے ہیں۔ درج ذیل اقتباس دیکھیے:

> ''۱۳ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی رات میں اور میرے احباب ریڈیو سے چپکے بیٹھے تھے جب بارہ کا گھنٹہ بج چکنے کے بعد اعلان ہُوا کہ یہ ریڈیو پاکستان ہے اور ایک نئی آزاد مملکت وجود میں آ گئی۔ اعلان سن کر ہم سب نے تالیاں بجائیں اور پھر ناچنا شروع کر دیا۔ بقیہ شب اسی طرح ہنستے کھیلتے گزر گئی۔ ویسے یہ کوئی جشن منانے کا موقع تو نہ تھا۔ مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے قافلے لاہور میں داخل ہو رہے تھے اور ان کی کسمپرسی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔'' (۲۲)

۱۹۴۸ میں جاوید اقبال نے ایم اے فلسفہ کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ مارچ ۱۹۴۹ میں منیرہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے انجام پائی۔

حوالہ جات:

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک''، (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۴ء) ص ۱۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۳۔ ایضاً، ص ۱۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۲

۷۔ ایضاً، ص ۱۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۳

۹۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۶۔ ایضاً،ص۱۵،۱۶

۱۷۔ ایضاً،ص۳۵

۱۸۔ ایضاً،ص۳۸

۱۹۔ ایضاً،ص۴۱

۲۰۔ ایضاً،ص۴۵

۲۱۔ ایضاً،ص۵۶،۵۷

۲۲۔ ایضاً،ص۶۱

☆☆☆

باب سوم

تعلیمی و عملی زندگی

جاوید اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج گئے کالج کے قواعد کے مطابق وہ صرف ایک سال تک اپنے کمرے میں ٹھہر سکتے تھے۔اس کے بعد رہائش کے لیے اپنا علیحدہ انتظام کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔قواعد کے مطابق کمرے میں خاتون مہمان کو رات ساڑھے دس بجے تک ٹھہرایا جا سکتا تھا۔رات بارہ بجے تک کالج کے مکین اپنے کمروں میں پہنچنے کے لیے صدر دروازے سے داخل ہو سکتے تھے بعد میں انہیں کالج کے پچھلے گیٹ کو پھلانگ کر اندر جانا پڑتا تھا اور اگر کوئی لڑکا دروازے پر چڑھتا پکڑا جاتا تو اسے خاصا نقصان اٹھانا پڑتا۔شام کے بعد کیمبرج شہر میں گھومنے پھرنے کے لیے ہر انڈر گریجوایٹ کے لیے چھوٹا اور ہر ریسرچ سکالر کے لیے لمبا گاؤن پہننا لازمی تھا ورنہ اس کا چالان ہو سکتا تھا۔لڑکیوں کے لیے کیمبرج میں دو کالج تھے ایک کا نام نیونہم اور دوسرے کا نام گرٹن تھا۔ان کالجوں میں بھی اسی طرح کے قواعد نافذ تھے۔

جاوید اقبال لندن کے لوگوں کے ہم جنس پرستی کے رجحان کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات واضح کرتے ہیں کہ چونکہ انہیں اس عمل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکے۔اس بیان میں جاوید اقبال نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ مناسب نہیں۔اس حقیقت کو ڈھکے چھپے انداز میں بیان کرنا زیادہ مناسب تھا۔

ڈرامہ نویسی کے شوق کی بدولت جاوید اقبال کو کیمبرج کے تھیٹر سے متعلق لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا۔جاوید بچپن میں شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر میں مارک اینتھونی کی معروف تقریر ڈرامائی انداز میں ادا کرنے پر دھنی رام کپ حاصل کر چکے تھے۔وہ کیمبرج میں بھی پرائیویٹ محفلوں میں مختلف اداکاروں اور اداکاراؤں کے ساتھ ایسی مشقوں میں شریک ہوئے۔جن میں سے زیادہ تر لوگ ہم جنس پرستی کی عادت میں

مبتلا تھے۔انہیں ایک اداکار نے بتایا کہ ڈرامے کی صنف کا تعلق یونان سے ہے اور یونانیوں کے نزدیک ایک مرد کا رفیقِ حیات مرد ہی ہوسکتا ہے ۔اس لیے تھیٹر کا اداکار صحیح معنوں میں اسے سمجھا جاتا ہے جو ہم جنس پرست ہو۔جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

''مجھے لندن کبھی پسند نہ آیا۔ یہاں ہمیشہ دھند رہتی اور پیدل چلتے وقت چہرے پر بارش کی مسلسل پھوار سے طبیعت سخت بیزار ہوتی ۔علاوہ اس کے فضا میں سیاہی کے سبب قمیضوں کے کالر، ناک منہ سب کالے ہوجایا کرتے ۔لندن میں میرے قیام کے دوران جن پاکستانی دوستوں سے ملاقاتیں رہیں ان میں اعجاز بٹالوی، ان کے بھائی عاشق بٹالوی اور مجید نظامی تھے ۔غلام مجدّد بھی بار کے امتحان پاس کرنے کی خاطر لندن آپہنچے ۔عیدین کی نمازیں ریجنٹ پارک کے اسلامی سنٹر میں پڑھی جاتیں۔۱۴ اگست کو یوم آزادی عموماً پاکستانی ہائی کمیشن کے لان میں منایا جاتا۔یہیں میری پہلی بار ملاقات ذوالفقار علی بھٹو سے ہوئی جو آکسفورڈ سے اس میں شرکت کے لیے لندن آئے ہوئے تھے۔دو تین بار بعد میں بھی لندن میں ان کی معیت میں وقت گزرا مگر وہ مجھ سے پیشتر انگلستان چھوڑ کر شاید امریکہ چلے گئے۔کیمبرج کے بعض دوست بھی اب لندن آگئے تھے ۔ان میں گہرے دوست تو ٹیڈی منیر اور باب باٹسفوڈ ہی تھے۔''(۱)

جاوید کے دوستوں کا ایک گروپ بنا ہوا تھا۔جاوید کی تحریروں کو شائع کروانے سے پہلے یہ گروپ سنتا تھا اور پھر مشورے بھی دیے جاتے تھے۔یہ گروپ ہر کام میں آگے آگے تھا۔جاوید اور اُن کا یہ گروپ بازارِ حسن میں گانا سننے بھی اکٹھے جایا کرتے تھے۔ایک دفعہ گانا سننے کے لیے گئے تو وہاں ایک بدمعاش کو چوان کی پٹائی کر رہا تھا جاوید سے برداشت نہ ہوسکا تو انہوں نے اس کی پٹائی کر ڈالی اور جب ڈاکٹریٹ اور بار ایٹ لاء کا امتحان پاس کرنے کے بعد خواجہ عبدالرحیم مرحوم کے ساتھ وکالت کا آغاز کیا تو اسی بدمعاش سے وہاں ملاقات ہوئی جب خواجہ صاحب نے تعارف

کروایا تو اُس نے کہا کہ ''میں تو ان کو بھول نہیں سکتا کیونکہ یہ میرا اعزاز ہے کہ میں نے ان سے مار کھائی ہوئی ہے۔''

۱۳اور۱۴اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی رات ریڈیو سے اعلان ہوا کہ یہ ریڈیو پاکستان ہے تو یوں آزادی کی ابتداء ہوئی۔ جاوید اور ان کے دوستوں نے تمام رات ہنستے کھیلتے گزاری۔ انہی دنوں ترقی پسند ادیبوں نے اپنے سوشلسٹ سیاسی فلسفے کے تحت ایسی تحریریں لکھیں جس میں یہ واضح کیا گیا کہ سرحدوں کی تقسیم سے تمدنی طور پر ہم ہندوستان سے جدا نہیں ہو سکتے۔ منٹو نے اس سلسلے میں چند ایسے افسانے لکھے جو کہ نہ صرف فحش تھے بلکہ اس سے مسلمانوں کی دل آزاری بھی ہوئی۔ چودھری محمد حسین اُس وقت پنجاب پریس کے معاملات کے مونیٹر تھے۔ اس لیے منٹو کا جو بھی افسانہ چھپتا اُس کو منع کرتے۔ اور جاوید کو بھی کہتے کہ تمہارے ان کے ساتھ تعلقات ہیں ان کو سمجھاؤ کہ پاکستانی شہری ہونے کی حیثیت سے ادیبوں کی کیا ذمہ داری ہے۔ احمد ندیم قاسمی سے جاوید کی ''نصب العین کے مسئلہ'' پر مضمون در مضمون بحث بھی ہوتی جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''وہ ترقی پسندی کے قائل ہیں لیکن ترقی پسندی کے شوق میں اشتراکیت کی تبلیغ نہیں کرنا چاہتے ہیں۔''

چوہدری صاحب کے حوالے سے جاوید اقبال کے یہ تاثرات بھی اہم ہیں۔ جولائی ۱۹۵۰ء میں چودھری محمد حسین کی وفات کی خبر انہیں ملتی ہے۔ جاوید کو شدید تنہائی کا احساس سُناتا ہے کیونکہ علامہ کے بعد چودھری محمد حسین ہی ایسی ہستی تھے۔ جنہوں نے صحیح معنوں میں ساتھ دیا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اکیلے ہو گئے ہیں والد کی وفات کے بعد پہلی دفعہ جاوید کو احساس تنہائی گھیر لیتا ہے۔ اس احساس میں تنہائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ انگریزی تمدن میں کھو جاتے ہیں۔

جاوید کے منتخب کردہ موضوع تحقیق پر کام کرنا مشکل مرحلہ تھا لیکن انہوں نے اس مشکل کو سر کر لیا تحقیق کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

> ''آمدنی کا ذریعہ یہ تھا کہ حکیم طاہر الدین کی وفات کے بعد کلامِ اقبال کی اشاعت سے متعلق آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب چودھری صاحب مرحوم نے اپنے بااعتماد کلرک میاں محمد طفیل کے حوالے کر دیا تھا۔ اور وہی کیمرج میں پچاس پاؤنڈ بھیجتے

تھے۔اس طرح جاوید کو پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔اس کے علاوہ جاوید منزل خواجہ عبدالرحیم (مرحوم) نے کرایے کے لیے لے لی تھی اس لیے آمدنی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔''(۲)

اس کے علاوہ جاوید نے بی بی سی کے ایک پروگرام میں شرکت کرنی شروع کردی۔اس پروگرام کا نام'' کیمرج لیٹر'' تھا۔اس میں وہ کیمرج کے پاکستانی اور بھارتی طلباء کی سرگرمیوں کے متعلق مزاحیہ انداز میں تبصرہ کیا کرتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ جاوید اپنا تحقیق کا کام بھی مکمل کررہے تھے۔اس کے علاوہ انہوں نے لندن جا کر لنکنز کے مخصوص تعداد میں ڈنرز میں شرکت کی اور پہلے چھ پرچوں میں کامیابی بھی حاصل کرلی۔جاوید اقبال کو تحقیق مکمل کرنے میں پانچ برس کا عرصہ لگا۔پہلے مرحلے میں انہوں نے تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔اس سلسلے میں انہوں نے قرآن وحدیث کے علاوہ ابن اسحاق،طبری اور مسلم مفکروں کی تحریریں بھی پڑھیں اور فارابی،غزالی،نصیرالدین طوسی،ابن خلدون وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ بھی کیا۔

دوسرے مرحلے میں انہوں نے برّصغیر ہند میں مسلم حکومت کے عروج وزوال کا جائزہ لینا تھا۔اور تیسرے مرحلے میں جاوید نے برّصغیر میں احیاء اسلام کے لیے جو کوششیں کی گئیں اُن کا مطالعہ کیا۔اس سلسلے میں انہوں نے ان ہستیوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جنہوں نے غیر مسلموں کے خلاف اور اس کے ساتھ ساتھ اُس وقت کی سیاسی معاشی اور معاشرتی حالات کے خلاف جہاد کیا۔چوتھے مرحلے میں مسلمانوں نے مغربی نظریات کا جو اثر قبول کرنا شروع کیا تھا اُس کے اثرات کے جائزے کے بارے میں مطالعہ کیا گیا۔یعنی یہ کہ مسلمان ماضی ہی میں کھوئے نہ رہیں اور مستقبل کو بھول نہ جائیں بلکہ انہیں چاہیے کہ ماضی کو چھوڑ کر مستقبل کی فکر کریں۔پانچویں مرحلے میں اتحاد اسلام اور خلافت اور مسلم قوم پرستی کی تحریکوں کا مطالعہ کیا گیا۔اس سلسلے میں انہیں جن دو شخصیات نے متاثر کیا وہ مولانا شبلی اور سید جمال الدین افغانی تھے۔

آخری مرحلے میں انہوں نے علامہ کے فکر کو سمجھا اور یہ اندازہ لگایا کہ علامہ اقبال کے کلام میں تمام مسلم انقلابی مفکرین کے تصورات موجود ہیں۔اس تحقیق کے دوران جاوید پر جو راز کھلا وہ یہ تھا کہ برصغیر میں جب سے

اسلام آیا، اُس وقت سے یہاں پنپنے کے لیے مختلف راہیں تلاش کی گئیں۔ کبھی مشاہدے اور کشف کے ذریعے، کبھی علماء کی وساطت سے۔ غرض مختلف ذریعوں سے اسلام کے پنپنے کے لیے کوششیں کی گئیں، تاہم واضح طور پر ۱۹۳۰ء اور بعد میں اس جدوجہد کا اصل مقصد ۱۹۴۷ء میں پورا ہوا جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

۱۹۵۴ء میں جاوید کا مقالہ مکمل ہوا، اس کے بعد زبانی امتحان ہوا۔ چونکہ کیمرج میں تعلیمی سلسلہ ختم ہو چکا تھا اس لیے اب وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس لیے وہ لندن آ گئے اور وہاں سے بار ایٹ لاء مکمل کیا اور واپسی کا سفر اختیار کیا کراچی بندرگاہ پر منیرہ اور میاں صلّی لینے آئے تھے۔ لاہور پہنچنے پر جاوید نے سب سے پہلا کام چودھری محمد حسین کی قبر پر جانے کا کیا۔ اُن کی قبر پر جا کر انہیں تنہائی کا احساس شدت سے ہوا اور اسی تنہائی کے احساس نے انہیں خوب رُلایا۔

جاوید اقبال نے جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو ابتداء میں انہیں مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تاہم میاں صلّی سے مدد لے کر انہوں نے اپنا پہلا دفتر کھولا۔ ابتداء میں چند لوگوں سے وکالت کے پیشے میں رقابت بہت پائی جاتی تھی کوئی مشہور وکیل اپنی کامیابی کے گُر نہیں بتاتا تھا کہ کہیں شاگرد آگے نہ نکل جائے لیکن منظور قادر مرحوم سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔

وطن واپسی کے بعد جاوید اقبال کراچی میں اپنے تایازاد اعجاز احمد کے ہاں مقیم تھے۔ قدرت اللہ شہاب نے فون پر انہیں بتایا کہ صدر سکندر مرزا نے انہیں لنچ کی دعوت دی ہے چنانچہ وہ ساڑھے بارہ بجے دوپہر ان کے ہاں پہنچ جائیں۔ سات ماہ پہلے جب جاوید اقبال انگلستان سے کراچی پہنچے تھے تو چودھری محمد علی وزیراعظم پاکستان کے فرائض سرانجام دے رہے تھے اور ان کی کوششوں سے ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ ہُوا تھا۔ جاوید ساڑھے بارہ بجے شہاب کے دفتر پہنچ گئے جو ایوان صدر میں واقع تھا۔ لنچ سادہ اور دلچسپ تھا۔ سکندر مرزا شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ یہ قدرت اللہ شہاب سے جاوید کی شناسائی کا آغاز تھا۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سکندر مرزا نے آئین ختم کر دیا اور اسمبلیاں تحلیل کر دی گئیں۔ ملک میں مارشل لاء لگ گیا اور ایوب خان مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''جو وجوہات سکندر مرزا نے پیش کیں، وہ یہ تھیں: ''ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے سیاستدانوں میں تباہ کن جنگ جاری تھی۔ بدعنوانی عام تھی۔ عوام کا استحصال ہو رہا تھا اور اسلام کو سیاسی مقاصد کی خاطر بطور ''طوائف'' استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایسے غیر یقینی اندرونی حالات انتخابات سے بھی درست ہو سکنے کا امکان نہ تھا۔'' بعد ازاں چیف جسٹس منیر کی زیر قیادت سپریم کورٹ نے اپنے ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فیصلہ میں اس کرتوت کو قانونی طور پر جائز قرار دیدیا مگر بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ سکندر مرزا سے فوج نے استعفی لیا اور ان کی جگہ جنرل ایوب خان صدر پاکستان بن گئے۔'' (۳)

سیاسی طور پر جاوید اقبال کے تعلقات لاہور میں میاں ممتاز دولتانہ سے تھے۔ دولتانہ صاحب اور ان کی بیگم اکثر جاوید کو اپنے گھر بلاتے رہتے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں کراچی جاتے تو فاطمہ جناح کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔ جسٹس شہاب الدین چند روز پاکستان کے چیف جسٹس رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے تھے ان کے ہاں بھی جاوید اقبال کا آنا جانا رہتا تھا۔

جاوید لاء کالج میں لیکچرار اور ریڈر کی حیثیت سے پڑھاتے بھی رہے۔ لاء کالج میں انہوں نے سے ۱۹۷۰ء تک پڑھایا اور اپنے شوق کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک ڈرامیٹک سوسائٹی بنائی اور ڈرامے سٹیج کرا کے اپنے ذوق کی تکمیل بھی کرتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے اپریل ۱۹۵۷ء میں اقبال اکادمی کی یوم اقبال کی تقریب میں شرکت کی اور وہاں پر انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا جس کا موضوع تھا۔ ''جدید اسلام میں لبرل ازم کی تحریک اور اقبال'' اس تقریب میں سردار عبدالرّب نشتر بھی موجود تھے۔ انہیں جاوید کی اس اصطلاح کی سمجھ نہیں آئی اور انہوں نے جاوید کو اپنی رہائش گاہ پر بلوایا اور اس کی وضاحت مانگی تو جاوید نے وضاحت کی کہ اصطلاح سے مراد وسیع النظری، رواداری اور کسی مخصوص فرقہ یا فقہی مکتبہ فکر کے نظریات سے بالاتر ہو کر سوچنا اور بذریعہ اجتہاد وقت کی ضروریات کے مطابق شریعت اسلامی کی تعبیر کرتے ہوئے قانون سازی میں نئے رستے تلاش کرنا ہے۔ اس بات کا سردار عبدالرب نشتر نے بہت

خوبصورت جواب دیا کہ اس تحریک کو لبرل ازم سے منسوب نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہی تو اصل اسلام ہے۔

اسی دوران شہاب نے رائٹرز گلڈ کے نام سے کچھ لوگوں کو اکٹھا کیا اور جاوید کو بھی دعوت دی۔ اس گلڈ میں مغربی پاکستان کے اکثر ادیب، شاعر اور دانشور بھی موجود تھے۔ جاوید نے وہاں اپنا انگریزی مقالہ ''حب الوطنی کے تقاضے اور ادیب'' بھی پڑھا۔ اسی گلڈ کی وساطت سے انہوں نے مشرقی پاکستان کا دورہ بھی کیا۔ اُن کے ساتھ ادیبوں میں قرۃ العین بھی شامل تھیں۔ جاوید کی ان کے ساتھ بے تکلفانہ دوستی تھی۔ عینی بھارت اور ہندو کلچر کو پسند کرتی تھیں۔ اس لیے جب ان کا ناول ''آگ کا دریا'' چھپا تو اس کے خلاف بہت سے تبصرے ہوئے اور وہ دلبرداشتہ ہو کر پاکستان چھوڑ کر بھارت چلی گئیں وہاں پر ان کو بہت پزیرائی ملی۔ جاوید اور عینی کی دوستی آج تک قائم ہے۔

کچھ سالوں کے بعد جاوید کو دوبارہ ڈھاکہ جانے کا اتفاق ہوا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہاں کے لوگ مغربی پاکستان سے نفرت کرتے تھے۔ اس کی وجہ مغربی پاکستان کے افسروں کا رویّہ تھا۔ مغربی پاکستان کے افسران کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے جو کہ انگریزوں نے کبھی ہمارے ساتھ کیا تھا۔

جاوید ہر سال یوم اقبال کی تقریب میں شرکت کرتے اور اپنا مقالہ پڑھتے۔ اس کے علاوہ ان کی دو اہم شخصیات سے دوستی بھی قائم ہوئی جو کہ عمر بھر قائم رہی ان میں سے ایک شخصیت این میری شمل تھیں۔ جو اقبال اسکالر کی حیثیت سے پہلی بار ۱۹۵۸ء میں جرمنی سے پاکستان آئیں اور یوم اقبال کی تقریب میں شریک بھی ہوئیں۔ دوسری شخصیت شیلا میڈونا تھیں جو کہ میگل یونیورسٹی (کینڈا) سے اپنا پی ایچ ڈی کے مقالے کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے لاہور آئیں اور کینز ڈ کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے انہوں نے اپنا کام شروع کیا۔ اُن کا موضوع تو ادیان کا تقابلی مطالعہ تھا لیکن وہ اقبال کے بعد پاکستان میں مذہبی رہنماؤں پر اقبال کے اثرات پر تحقیق کر رہی تھیں۔

جاوید اقبال شادی کرنے سے ڈرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خوف زدہ تھے کہ طبیعتوں میں مناسبت نہ ہونے کے باعث کہیں نوبت طلاق تک نہ پہنچ جائے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یورپی خواتین سے ملنے جلنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے تھے لیکن مشرقی عورتوں کی شرم وحیا اور حجاب کے باعث ان سے ڈھنگ سے گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ عورت میں جس خصوصیت کو خود اعتمادی سمجھنا چاہیئے اسے ہمارے معاشرے میں بے باکی

سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے۔

جاوید منزل کی چھتیں بوسیدہ ہو چکی تھیں اس لیے جاوید نے ان کی مرمت کروائی اور گھر کو صحیح طریقے سے سیٹ کیا اور پھر منیرہ کے اصرار پر جون ۱۹۶۴ء میں جاوید اقبال نے ناصرہ سے شادی کر لی۔ شادی کے فوراً بعد جو کام جاوید اقبال نے کیا وہ مادرِ ملّت کو صدارتی انتخاب کے لیے جتوانا تھا۔ اس لیے انہوں نے اور بہت سے نوجوانوں نے بھرپور حصّہ لیا۔ جاوید نے توجھنگ میں پولنگ ایجنٹ کے طور پر کام کیا۔ اس الیکشن میں وہ جیت تو نہ سکیں لیکن اس کے بعد صدر ایوب کا زوال شروع ہو گیا۔

جاوید اقبال کو دوبارہ ۱۹۶۵ء میں ہائیکورٹ کی ججی قبول کرنے کا کہا گیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر جواب دے دیا کہ وہ ابھی سیاست میں حصہ لے کر ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اسی دوران ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا صدر ایوب ۱۹۶۲ء میں کشمیر حاصل کرنے کا ایک موقع صدر کینڈی کے کہنے پر گنوا چکے تھے۔ لیکن امریکہ نے اپنا کوئی وعدہ پورا نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بھارت کی جنگ میں پاکستان کا ساتھ دیا۔ اس لیے مجبوری کے طور پر پاکستان کو روس کو ثالث بنانا پڑا جس کی وجہ سے بھٹو اور صدر ایوب میں اختلاف پیدا ہوا اور صدر ایوب نے انہیں کابینہ سے نکال دیا۔

جاوید اقبال کی بیوی ناصرہ کا تعلق ایک تاجر اور صنعت کار گھرانے سے تھا اس لیے انہوں نے جاوید منزل میں جو دوکانیں تقریباً چھبیس روپے ماہوار پر کرائے پر تھیں ان کو مرمت کروا کر فی دوکان دو سو روپے ماہوار کرائے پر دے دیا اور پچھلی کوٹھریوں کو بھی گلی میں کھول کر انہیں کرایے پر دے دیا۔ اس کے علاوہ دوکانوں کے اوپر دو فلیٹ بنا کر بھی انہیں کرایے پر چڑھا دیا۔ وہی جائیداد جس سے صرف باون روپے کرایہ آیا کرتا تھا اب وہاں سے تقریباً چھ ہزار کرایہ ملنے لگا۔ جاوید اقبال کے پہلے بیٹے ''منیب'' کی پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ہوئی اور دوسرا بیٹا ولید یکم اگست ۱۹۶۷ء کو پیدا ہوا۔ جاوید اور منیرہ کی زندگی آسودگی سے گزر رہی تھی۔ کیونکہ ایک تو پریکٹس کی آمدنی دوسرے تصانیف کی رائلٹی سے بھی کافی آمدنی مل جاتی تھی۔ بچے ایچی سن کالج میں پڑھتے تھے اور انہیں سکول آنے جانے کے لیے ایک کی بجائے دو گاڑیاں موجود تھیں۔ جاوید کے بقول وہ سہولتیں جو ولید اور منیب کو میسر تھیں وہ انہیں اور

منیرہ کو میسر نہ تھیں۔ ولید اور منیب دونوں مختلف فطرت کے ہیں۔ منیب انگریزی میں اشعار لکھتا ہے اور خاص طور پر ''سونٹ''۔ ولید پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ منیب وکالت کرتا ہے۔ ولید کو چونکہ تعلیم سے زیادہ دلچسپی تھی اس لیے اُس نے پین سیلو یونیورسٹی سے بزنس کی ڈگری لی اور بعد میں کچھ دیر فیروز سنز لیبارٹریز کے لاہور کے دفتر کا چارج سنبھالا اور لاہور کے ایک پرائیوٹ کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری لی، کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج میں بھی داخل رہے اس کے بعد کیمرج اور بعد میں پیمبروک میں داخل ہو کر اہم۔فل کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے اچھے تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے اُسے ہارورڈ لاء اسکول امریکہ میں داخلہ مل گیا جہاں سے اُس نے ایل ایل ایم کیا اور بعد میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

جاوید اقبال کی زیادہ توجہ سیاست کی طرف تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے بار کی سیاست میں حصہ لیا اور واضح کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی کے بعد انہوں نے لاہور کی بار ایسوسی ایشن کے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنرل ایوب کے خلاف ملک بھر میں احتجاجی جلوس شروع ہو گئے تھے۔ بھٹو کا تعلق تو مسلم لیگ سے تھا لیکن وہ اپنی نئی جماعت پیپلز پارٹی بنانے کی بھرپور کوششوں میں لگے ہوتے تھے۔ جاوید کی بھٹو سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پیپلز پارٹی اور اس کے نعرے ''اسلامی سوشلزم'' روٹی، کپڑا، مکان کے بارے میں بتایا تو جاوید نے کہا کہ مسلم لیگ کا ایجنڈا ابھی تو یہی ہے اور اس کے لیے اصطلاح ''اسلام'' ہی کافی ہے۔

تاہم بھٹو کو قید کر لیا گیا لیکن جنرل ایوب کے خلاف تحریک جاری رہی۔ حالات جب جنرل ایوب کے قابو سے باہر ہو گئے تو انہوں نے اپنے بنائے ہوئے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقتدار اسمبلی کے سپیکر کو دینے کی بجائے بذریعہ خط جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دیا۔ اس بارے میں جاوید کہتے ہیں کہ:

> ''بھٹو جاتے جاتے ہمیں اسلام کے نام پر چند مزید ایسے تحفے عطا کر گئے جن سے قائداعظم کی ''جدید لبرل اسلامی فلاحی جمہوریت'' کے تصور کو نقصان پہنچا۔ رجعت پسند مذہبی عناصر، جن کے ''جن'' کو قائداعظم کی بلند قامت شخصیت نے بوتل میں بند کر رکھا تھا، رہائی اور زبان مل گئی اور بچے کھچے پاکستان میں علاقہ پرستی، مذہبی منافقت

اور فرقہ وارانہ تعصّبات نے فروغ پانا شروع کر دیا۔" (۴)

بھٹو کو رہائی ملی اور وہ پھر پورے زور و شور سے سیاست کے میدان میں آ گئے۔ مغربی پاکستان میں مضبوط پارٹی بھٹو کی پیپلز پارٹی تھی لیکن مشرقی پاکستان میں اسے کوئی مقبولیت حاصل نہ تھی۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ مقبول تھی اور اسے مغربی پاکستان میں کوئی مقبولیت حاصل نہ تھی۔ الیکشن میں جاوید اقبال نے بھی حصّہ لیا۔ اور بھٹو کے مقابلے میں کھڑے ہوئے لیکن ناکام رہے۔ لیکن اس ناکامی کا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے عملی سیاست کو چھوڑ دیا اور جسٹس کا عہدہ قبول کیا۔ اس دوران یحییٰ خان نے دوبارہ سیاست میں آنے کی پیش کش کی کہ الیکشن دوبارہ سے کروائے جا رہے ہیں وہ واپس لوٹ آئیں لیکن جاوید نے اُنہیں جواب دیا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اُن میں ملکی سیاست میں حصہ لینے کی صلاحیت نہیں ہے۔

مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور دوسرا بھٹو بھی اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ وہ حکومت سازی کریں۔ ملٹری ایکشن کے دوران مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا اور وہاں کے لوگوں نے مغربی پاکستان کے رہنے والے لوگوں پر بہت ظلم و ستم ڈھایا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان میں داخل کر دیں اور مغربی پاکستان کی افواج نے مشرق کا دباؤ کم کرنے کے لیے بھارت پر حملہ کر دیا لیکن کوئی بھی دوست ملک چین یا امریکہ مدد کو نہ آئے۔ اس میں پاکستان کو ناکامی ہوئی اور یوں مشرقی پاکستان ایک الگ وطن "بنگلہ دیش" کے نام سے معرضِ وجود میں آیا۔

مغربی پاکستان میں بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو جنرل یحییٰ خان کو حفاظتی تحویل میں ایبٹ آباد کے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں بھجوا دیا گیا۔ بھٹو حکومت کا سب سے پہلا کام تو جنگی قیدیوں کی رہائی کا تھا۔ اس سلسلے میں اندرا گاندھی اور ان میں شملہ معاہدہ ہوا جس کے تحت جنگی قیدیوں کو تو رہائی ملی لیکن مسئلہ کشمیر التوا میں پڑ گیا۔

جاوید اقبال مختلف ملٹری کالجوں میں لیکچر دینے کے لیے جایا کرتے تھے لیکن بھٹو نے پابندی لگا دی کہ کوئی جج کسی کالج میں لیکچر کے لئے نہیں جائے گا تاہم ان کو ملک سے باہر جانے کی اجازت تھی۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں جاوید اقبال دو مرتبہ ملک سے باہر گئے ایک دفعہ امریکہ اور دوسری دفعہ اٹلی۔ پہلی دفعہ لیڈر شپ پروگرام کے تحت

ان کو امریکہ یاترا کی دعوت ملی۔ وہاں پر انہیں فیڈرل سپریم کورٹ کے معروف جج اوڈگلس سے ملاقات کا موقع ملا۔ جو ہر بات تھوڑی دیر کے بعد بھول جایا کرتے تھے لیکن ابھی تک جج کے عہدے پر فائز تھے کیونکہ وہاں کے اصول مطابق جج کی ریٹائرمنٹ کی کوئی عمر نہ تھی البتہ وہ خود چاہتا تو ریٹائر ہوسکتا تھا۔ جاوید کو وہاں کی عدالتیں اور جج صاحبان سے ملنے کا موقع بھی ملا۔

جاوید اقبال واشنگٹن سے بالٹی مور چلے گئے جہاں اُنہوں نے ججوں کے ایک سیمنار میں شرکت کی۔ واپسی پر سان فرانسسکو ٹھہرے اور برکلے یونیورسٹی میں ''اسلامی تصوف'' کے موضوع پر لیکچر دیا۔ اور پھر نیویارک اور لندن سے ہوتے ہوئے تہران پہنچے۔ تہران یونیورسٹی میں انہوں نے پاکستان اور ایران کے موضوع پر لیکچر دیا۔ اور پھر اصفہان، سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ اور سفر کی رپوٹ بھٹو کو روانہ کی اور امریکہ میں سفیر اور حالات کے بارے میں بتایا۔

۱۹۷۷ء کے شروع ہونے سے پہلے ہی اقبال کے صد سالہ جشن ولادت منانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں ۔اس سلسلے میں ایک اقبال کمیٹی بنائی گئی جن کا پہلا مقصد تو جاوید منزل کو خرید کر میوزیم میں تبدیل کرنا اور دوسرا مقصد مزار کی ازسرِ نو تعمیر تھی۔ پہلی بات تو جاوید اقبال نے مان لی لیکن مزار کی تبدیلی کی بات نہ مانی کیونکہ اُن کے بقول یہ مزار مسلمانوں کے چندے سے بنا ہے اور مزار کی تعمیر کے لیے بھی ایسا نقشہ پاس کیا گیا جو کہ بادشاہی مسجد کی شان کو بھی بلند کرتا ہے اور اقبال کی فقر و سادگی اور عزم کا علمبردار بھی ہے اور اس پر جو اشعار کندہ کیے گئے ہیں وہ بھی چودھری محمد حسین نے علامہ کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر لکھوائے تھے۔ مزار کی دوبارہ تعمیر کے لیے انہیں مسمار کرنا ضروری تھا جو کہ جاوید کو منظور نہ تھا۔ کمیٹی نے ان کی اس تجویز کو مان لیا لیکن بھٹو کے کہنے پر مزار کے آگے گارڈز کے کھڑے ہونے کے لیے چبوترے کی تعمیر کروا دیے گئے۔ اور گارڈز کی تبدیلی کا انتظام بھی قائم کیا گیا۔

جاوید منزل کو میوزیم میں تبدیل کرنا باقی تھا کہ بھٹو کے حالات میں تبدیلی آ گئی۔ بھٹو نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے وقت سے پہلے انتخابات کروا دیے جن میں پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی لیکن مخالف پارٹی نے کہا کہ یہ سب کچھ دھاندلی سے ہوا ہے۔ اس لیے ان کے خلاف مظاہرے ہونے لگے۔ بھٹو نے ''منی مارشل لاء''

لگادیا۔فوج نے مظاہرین پر گولیاں چلائیں چندلوگ مارے گئے اور رٹ دائر کردی گئی۔مقدمات چلتے رہے۔

جاوید اقبال پاکستان کے سیاسی نظام پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان میں یہ روایت ہے کہ جب کوئی حکومت قائم کرنی ہو یا حکومت گرانی ہو تو اسلام کا سہارا لیا جاتا ہے۔اب بھی یہی ہوا اور نظامِ مصطفیٰ تحریک بھٹو کے خلاف چلائی گئی اور کئی مذہبی مطالبات منوائے گئے۔تاہم اس کا مقصد اسلام کو پھیلانا نہیں تھا صرف اور صرف سیاست کرنا تھا۔جنرل محمد ضاء الحق کے اقتدار حاصل کرنے اور اس کے بعد انہوں نے پاکستان میں نئے تجربے کا آغاز کیا۔انہوں نے اسلام کے نعرے پر ہی اپنی حکومت مضبوط کرنے کی کوشش کی اور مختلف اسلامی اصطلاحات نافذ کیں ان میں سے ایک فارم پر مذہب کا اندراج کرنا ضروری تھا اور اگر کسی سے حلف لیا جاتا تو یہ کہا جاتا کہ حلف لینے والا قادیانی نہیں ہے۔اس کے علاوہ توہین رسالت کا قانون بنا جس کی وجہ سے غیر مسلم اقلیتوں میں خوف وہراس پھیلا شریعت کورٹ قائم کیے گئے جہاں پر صرف سرقہ،صربہ یا زنا کے کیس سنے جاتے اور مجرموں کو اسلامی سزا دی جاتی۔اس عدالت کے جج کا مسلمان ہونا ضروری تھا اور اس کو رکھنے یا ہٹا دینے کا اختیار صرف اور صرف جنرل ضیاء الحق کے پاس تھا۔اس کے علاوہ حدودِ آرڈیننس نافذ کیا گیا۔عورت کی گواہی آدھی کردی گئی اور اسلامائزیشن کے نام پر مسائل اور بڑھ گئے۔

جاوید اقبال نے ''اپنا گریباں چاک'' میں معاشرتی بے اعتدالی کا بیان بڑی جرأت کے ساتھ کیا ہے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں جب حدود آرڈیننس کا نفاذ ہُوا تو انہوں نے صاف انداز میں ضیاء الحق کو بتایا کہ عورتوں کے حوالے سے اس آرڈیننس کو کس انداز میں غلط طور سے استعمال کیا جارہا ہے اور اس ظلم کو روکنے کے لیے کوئی لیجیسلیٹو ترکیب ضروری ہے لیکن جاوید اقبال کی اس بات نے ضیاء الحق پر کوئی اثر نہ کیا اور انہوں نے کہا کہ حکومت نے صدق دل سے آرڈیننس نافذ کردیا ہے اور اگر پولیس یا قوم کرپٹ ہے تو اس سلسلے میں حکمران کیا کرسکتے ہیں؟

عدلیہ پر انتظامیہ کے کنٹرول کی کوششوں کو بھی جاوید اقبال نے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔تجربے نے ان پر یہ بات واضح کی کہ انتظامیہ کسی نہ کسی انداز سے عدلیہ پر اپنا کنٹرول قائم رکھنا چاہتی ہے مثلاً مالی معاملات میں اور اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کے لیے عدلیہ کا انحصار انتظامیہ پر تھا اگر کسی ماتحت جوڈیشل آفیسر کو کرپشن کے

الزام میں ہائی کورٹ کے سینئر جج کی انکوائری کے بعد ہٹا دینے کی سفارش کی جاتی تو اس کی اپیل سننے کا اختیار انتظامیہ نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور اپیل منظور ہو جانے کے بعد صوبے کا سیکرٹری چیف جسٹس کو کہہ سکتا تھا کہ چونکہ اس کی اپیل منظور ہو چکی ہے اس لیے اسے دوبارہ جوڈیشل سروس میں تعینات کیا جائے۔ ایسے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے تھے۔ اس ضمن میں جاوید اقبال لکھتے ہیں؛

> ''میرے مشاہدے میں بعض اوقات ایسے معاملات بھی آئے جب کوئی جوڈیشل آفیسر کسی نوجوان خاتون کی طلاق کا کیس یا اس کی اپیل محض اس لیے لٹکاتا ہے کہ وہ اس کی ناجائز خواہشات کو پورا کرے۔ ایسے کیسوں میں مَیں نے بعض جوڈیشل آفیسروں کو چوبیس گھنٹے کے اندر ٹرانسفر کیے جانے کے احکامات جاری کیے۔ اس ملک میں اگر کوئی خاتون ہمت کر کے بذات خود روزی کمانے کی خاطر نکلے تو اسے قدم قدم پر ''بھیڑیوں'' سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ چھوٹے قصبوں یا شہروں میں عموماً اسکولوں کی استانیاں، زنانہ کالجوں کی نوجوان لیکچرار، ہسپتال کی نرسیں وغیرہ اپنے مقدمات میں سول یا جوڈیشل آفیسروں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں۔ اگر کسی جوڈیشل آفیسر کے متعلق ایسی کوئی شکایت مجھ تک پہنچتی تھی تو میں فوراً ایکشن لیا کرتا تھا۔''(۶)

ان نئے قانون اور ضابطوں کی وجہ سے لوگوں نے اپنا بدلہ لینے کے لیے قتل جیسے سنگین جرائم کا آغاز کیا۔ یعنی کسی سے دشمنی ہوئی تو اپنی بہن یا بیٹی کو مار دینا اور اُس کے بعد جس بندے سے دشمنی ہو اس کو قتل کر دینا اور دونوں کو اکھٹا کر کے پولیس کو بلوا لینا اور یہ بیان دینا کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق تھا جس کی وجہ سے انہوں نے قتل کر دیا۔ یوں بدلہ بھی لے لیا جاتا تھا اور سزا بھی نہ مل پاتی۔ جاوید اقبال چند کیسوں کے ذریعے اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اسلام کے نام پر کیے گئے جرم کے بعد میں جب ان کے سامنے کیس لایا گیا تو انہوں نے تحقیق کے بعد مجرم کو سزا دلوائی۔ حدود آرڈیننس کے تحت مجرم تو بہت سے پکڑے گئے لیکن شہادت نہ ہونے کے باعث سزا کسی کو نہ مل سکی اور یوں چوری، ڈکیتی اور قتل کے کیس ملک میں بہت بڑھ گئے اس سے نہ صرف یہ کہ جرائم بڑھے بلکہ ''اسلامائزیشن'' کے تحت

غیر مسلم اقلیتوں اور مسلمانوں میں کچھ اس طرح سے فرق کیا گیا کہ غیر مسلموں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ گیا۔

چیف ججی کے چار سالوں میں جاوید اقبال نے کچھ انتظامی تبدیلیاں بھی کیں ان میں سے پہلی یہ تھی کہ انتظامی امور اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بجائے انتظامی کمیٹی کے سینئر ججوں میں بانٹ دیے۔ ہر چیف جسٹس اپنا مرضی کا عملہ چنتا تھا۔لیکن جاوید اقبال نے پرانے عملے کے ساتھ ہی کام جاری رکھا۔انہوں نے کورٹ میں صلاح مشورے کا رویّہ اپنایا اور ہر معاملے میں ساتھی جج صاحبان سے مشورہ لیا جاتا کورٹ میں کھچاؤ اور چپقلش ختم کر دی گئی۔کسی جج کو سزا کے طور پر دوسری بینچوں میں لاہور سے باہر نہیں بھیجا جاتا تھا۔

ان حالات میں جو چیز ان کے تجربے میں آئی وہ یہ تھی کہ انتظامیہ کسی نہ کسی صورت میں عدلیہ پر اپنا کنٹرول رکھے ہوئے تھی اور وہ بات جس کے خلاف جسٹس جاوید اقبال نے سٹینڈ لیا اور اس کو تسلیم بھی کیا گیا وہ یہ تھی کہ جوڈیشل افسر کو بدعنوانی کے تحت نکالے جانا پر سپریم کورٹ اس کی اپیل سننے کی بجائے انتظامیہ سنتی اور پھر اس کی اپیل منظور بھی ہو جاتی اور اس کے دوبارہ تعینات ہونے کے آرڈر دیئے جاتے جاوید اقبال کے سٹینڈ لینے پر یہ ختم ہوا اور اُن کی دوبارہ تقرری ہونا ناممکن ہوگئی۔اس کے علاوہ جاوید کا بطور چیف جسٹس اہم کارنامہ نچلی عدلیہ میں میرٹ کے ذریعے جوڈیشل افسران اور ججوں کی بھرتی تھی لیکن ان کے بعد وہی پرانا سفارشی طریقہ رائج ہوگیا۔جسٹس جاوید اقبال نے ماتحت عدلیہ کا جائزہ لینے کے لیے جب پنجاب بھر کا دورہ کیا تو ان کے تجربے میں آیا کہ بنیادی سہولتوں کی کمی ہے اور جج صاحبان کو ہزاروں مسائل درپیش تھے۔حالانکہ ڈپٹی کمشنر، تحصیلدار اور اسسٹنٹ کمشنر کے لیے سرکاری گاڑیاں اور رہائش کے لیے سرکاری انتظامات کیے جاتے لیکن جوڈیشل آفیسر کے لیے کسی قسم کی سہولت موجود نہ تھی جس کی وجہ سے رشوت عام ہو رہی تھی۔

جاوید اقبال کی چیف ججی کا دور ہیجانی دور نہیں تھا کیونکہ حالات آہستہ آہستہ عسکریت سے جمہوریت کی طرف مائل ہوئے جا رہے تھے۔جاوید اقبال بطور جج اپنے رویے کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہ صبر و تحمل سے ہر کسی کو سنتے تھے اور جلد غصے میں نہیں آتے تھے۔اس لیے ''لبرل'' یا ''وسیع النظر'' جج کے طور پر مشہور تھے۔بطور فلسفہ کے طالب علم ہونے کے اور ڈرامہ نگار کے طور پر پھانسی کی سزا کم دیتے تھے

۱۹۸۳ء میں جاوید اور ناصرہ جزائر مالدیپ میں ''جنوبی ایشیاء میں اسلام'' کے موضوع پر کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے۔ جزائر مالدیپ میں نوّے فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ یہ سمندر میں گھرے ہوئے جزیروں کی سرزمین ہے۔ یہاں حکومت کی آمدنی کے ذرائع سیاحت اور سمندر سے مچھلیاں پکڑنا تھا۔ اُس دور میں دارالحکومت مالے میں چند سرکاری عمارتیں تھیں اور ایک بڑا بازار بھی تھا جس میں ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ یہاں پر زیادہ لوگ پیدل چلتے ہیں یا سائیکلیں استعمال کرتے ہیں موٹر کار صرف ایک آدھ تھی جو کہ شاید صدر کے استعمال میں تھی۔ تاہم یہاں تعلیم کا معیار بہت بلند تھا اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر بھی بہت سے قوانین تھے۔ مالے کی ایک بہت خوبصورت جامع مسجد ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں مالے کے لوگ ایک سمندری عفریت کو پوجتے تھے جو ہر سال سمندر سے نکل کر جزیرہ مالے پر آبیٹھتا تھا جس کی خاطر کنواری لڑکیوں کی قربانی دی جاتی تھی لیکن ایک مسلم برگزیدہ ہستی کا جہاز وہاں لنگر انداز ہوا تو انہوں نے اس سمندری عفریت کو مار ڈالا اور اس جگہ یہ مسجد تعمیر کی۔

جاوید اقبال کو جس بات نے حیرت میں ڈالا وہ مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک میں روحانی علاج معالجے کی مقبولیت تھی تاہم ان کے ہاں تعلیم کا معیار بہت بلند تھا۔ لیکن اس کے باوجود توہم پرستی حیرانی کا باعث تھی کیونکہ جاوید کے خیال میں روحانی طریقہ علاج تو جاہلوں میں مقبول ہوسکتا ہے۔ جاوید اپنا مشاہدہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے والد دادا کی اجازت سے پان پر قلم اور سیاہی کے ساتھ کوئی آیت تحریر کر کے باری کے بخار کے مریض کو دیا کرتے تھے۔ جس کے چاٹنے سے بخار اتر جاتا تھا۔ جاوید کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آتا ہے کہ وہ ان کے دوست جسٹس سید محمد کرم شاہ مرحوم (سجادہ نشین بھیرہ) کسی غیر آباد جزیرے میں سیر کر رہے تھے کہ جاوید کے بازو پر کسی مچھر نما شے نے کاٹا اور اچانک بازو سوج کر سرخ ہوگیا۔ اور تکلیف بہت زیادہ ہونے لگی، شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر بازو پر پھونک ماری اور اچانک درد اور سوجن ختم ہوگئی۔ اسی طرح سے ان ملکوں میں بھی روحانی طریقے سے علاج کیا جاتا اور شفا ہوجاتی تھی۔

وکالت جسٹس جاوید اقبال کے بقول ان کا خاندانی پیشہ بنتا جارہا تھا کیونکہ بچے جب دونوں پڑھنے کے

لیے باہر چلے گئے تو ناصرہ جاوید نے لاء کالج میں داخلہ لیا اور ایل ایل بی اور بعد میں ایل ایل ایم کی ڈگریاں حاصل کیں۔اس کے بعد ہارورڈ یونیورسٹی سے ایل ایل ایم کی اعزازی ڈگری حاصل کی اور چیمبر پریکٹس شروع کر دی کیونکہ کورٹ میں وہ پیش ہو کر اپنے شوہر کو بطور چیف جسٹس شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔۱۹۸۵ء ہی میں جسٹس جاوید اقبال مصر میں یومِ اقبال کی تقریبات میں شرکت کے لیے بھی گئے۔وہاں انہوں نے وہ تمام مقامات دیکھے جو اقبال نے سفرِ مصر کے دوران دیکھے تھے اور انہوں نے قاہرہ اور عین الشمس اور الازہر یونیورسٹیوں میں فکرِ اقبال کے موضوع پر لیکچر بھی دیئے۔

۱۹۸۶ء میں جاوید اقبال تہران میں بین الاقوامی اقبال کانگریس میں شرکت کے لئے گئے۔اس کانگریس میں امام خمینی نے علامہ اقبال پر دو گھنٹے کی زبانی تقریر کی اور سینکڑوں اشعار کے حوالے بھی دیے۔اس سے امام خمینی کی اقبال سے محبت کے اظہار کا ثبوت ملتا ہے۔جاوید اقبال نے اپنی فارسی کی تقریر میں اقبال شناسی پر خوب داد دی۔اس کانگریس میں جاوید کا مقالہ ''اقبال کے تصورِ اسلامی اتحاد اور تیسری دنیا'' کے موضوع پر تھا۔اس کے بعد انہوں نے مشہد میں علی شریعتی یونیورسٹی میں ''اقبال اور علی شریعتی'' کے موضوع پر لیکچر دیا۔اور امام رضا کے مزار پر حاضری بھی دی۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں تقریباً باسٹھ برس کی عمر میں جب جاوید اقبال کے ریٹائرمنٹ کا وقت قریب تھا۔ وزیراعظم جونیجو نے بلوایا اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر قائم رہنے کی دعوت دی اور کہا کہ انہیں پہلے سپریم کورٹ بھیجا جائے گا اور بعد میں واپس لاہور ہائی کورٹ لایا جائے گا۔لیکن جاوید اقبال نے یہ دعوت قبول نہ کی کیونکہ وہ اپنے جونیئر ساتھی کا حق غصب کرنا نہیں چاہتے تھے۔تاہم سپریم کورٹ میں بطور جج تقرری اُنہیں منظور تھی۔ان کی اس بات کو مان لیا گیا اور جس دن جاوید ریٹائر ہوئے اُسی دن سے انہیں سپریم کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔

''عدالتِ عظمیٰ کے تین برس'' میں انتظامیہ کی ریشہ دوانیوں اور رائے عامہ کی عدلیہ کے حق میں عدم موجودگی کے سبب عدلیہ رفتہ رفتہ تنزل کی طرف جا رہی ہے۔ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ سردار اقبال کو فارغ کر کے بہت ناانصافی کی گئی۔جنرل ضیاء الحق کے دور میں مجید نظامی کے کہنے پر یا شاید

ویسے ہی جنرل ضاء الحق نے جسٹس سردار اقبال سے ملاقات کی اور انہیں پاکستان کا سب سے پہلا محتسب مقرر کر کے ان کے ساتھ ہونے والی گزشتہ زیادتی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۸۷ء میں جاوید کئی بار ملک سے باہر گئے وہ اسلامی تہذیبی میراث کے تحفظ کی خاطر گورننگ کونسل کے اجلاس کے لیے ہر سال استنبول جاتے تھے۔اس سال یہ اجلاس دمشق میں ہوا،انہوں نے یہاں کی مشہور عمارات اور مساجد دیکھیں وہ حضرت بی بی زینبؑ کے مزار اور علی شریعتی کی قبر پر بھی گئے وہ کہتے ہیں کہ اسلامی تمدن اور تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اسلامی ممالک کا سفر ہر طالب علم کے لیے بہت ضروری ہے۔علامہ اقبال پر ان کا لیکچر حافظ الاسد ہال میں ہوا جس میں ہجوم کا یہ عالم تھا کہ مردوں اور عورتوں نے یہ لیکچر کھڑے ہو کر سنا۔جاوید شامیوں کی اقبال کے افکار میں دلچسپی دیکھ کر حیران رہ گئے۔یہیں ان کا ایک اقبال شناس سے تعارف ہوا جنہوں نے ''بالِ جبریل'' کا اُردو سے عربی میں ترجمہ کیا۔وہاں ''دارالاقبال'' نامی پرنٹنگ پریس بھی ہے۔''زندہ رود'' کے عربی ترجمے پر نظر ثانی بھی شامی اقبال شناسوں نے ہی کی لیکن ابھی تک اس کتاب کا عربی ترجمہ شائع نہیں ہو سکا۔

''مستقبل کی تعمیر'' میں ایک منجم کے اندازے کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ۱۲۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء سے لے کر ۱۵ جولائی ۱۹۸۶ء تک کا عرصہ ایسا ہوگا جس کے دوران ان کے ستارے آپس میں ہم آہنگی کی بجائے ٹکراؤ کی صورت اختیار کریں گے اور اسی ٹکراؤ کے زیرِ اثر یہ ان کی ارضی زندگی کا آخری دور ہوگا۔لیکن اُس منجم کا حساب کتاب صحیح نہیں نکلا کیونکہ ان کے حالات مختلف تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جاوید لاہور واپس آ گئے۔ان کا سب سے پہلا مقصد اپنے آپ کو مصروف کرنا تھا۔اس کے لیے انہوں نے ڈرامہ نویسی میں نئے تجربے کیے لیکن ان ڈراموں پر مختلف اعتراضات ہوتے جس کی وجہ سے انہوں نے بالآخر ڈرامہ نویسی سے توبہ کر لی۔اس کے بعد کلام اقبال کے اردو حصے کی تشریح لکھنے کا ارادہ کیا لیکن یہ کام بھی ادھورا رہ گیا۔جنوری ۱۹۹۰ء میں عراق میں بین الاقوامی اسلامی معاملات کی سپریم کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے۔وہاں انہوں نے زیارتیں بھی کیں اور بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ مسلمان کی دینی اور تمدنی تعلیم،عراق میں زیارات دیکھے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔بلکہ یمن،سعودی عرب،ایران،اردن،شام،فلسطین،ترکی،مصر،تیونسیہ،مراکو اور اندلس دیکھے بغیر ایسا ممکن نہیں کیونکہ ان ممالک میں مسلمانوں کی دینی اور تمدنی تاریخ بکھری پڑی ہے۔وہ دجلہ فرات،نجف کے علاقوں میں گئے۔نجف

میں حضرت علیؓ کا مزار اور ان کا گھر دیکھنے کا بھی موقع ملا جہاں پر وہ اور ناصرہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔

۱۹۹۷ء اور اس کی اہمیت کا ذکر کرتے ہیں تو اسی سال الیکشن میں نواز شریف کی کامیابی اور پیپلز پارٹی کی شکست کا ذکر بھی کرتے ہیں اسی سال میاں نواز شریف نے یوم اقبال کے جلسے میں شرکت کی اور جاوید نے اپنی تقریر میں کہا کہ اقتدار پر صرف اکیلے ہی قبضہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ دوسروں کے مشورے سے اسے بانٹ لینا چاہیے۔

اسی دوران دستور میں ترمیم کے ذریعے آرٹیکل ۵۸ (دو۔ب) کو ختم کر دیا گیا۔اس طرح فاروق لغاری کے پاس صدر کا عہدہ تو تھا لیکن وہ اسمبلی پر وار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

۱۹۹۷ء میں بھی جاوید کئی بار ملک سے باہر گئے اسی سال قیام پاکستان کے پچاس برس ہونے پر ملک کے اندر اور باہر بھی بہت سی تقاریب ہوئیں جن میں انہوں نے شرکت کی۔ وہ وزیر اعظم نواز شریف اور ان کی حکومت کے ''کرائسس'' کا ذکر کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی حکومت الٹنے کے لیے بہت سی سازشیں ہو رہی تھیں۔اسی دوران ایٹمی دھماکہ کر کے انہوں نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کی کوشش بھی کی۔

۱۹۹۸ء میں مسلم لیگ کی حکومت اپنے جوبن پر تھی۔ بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر کے خلاف بدعنوانی کے مقدمات دائر تھے اور جو زیادتیاں بے نظیر نے کیں ان کا بدلہ لیا جا رہا تھا۔اسی دوران نواز شریف حکومت نے ایران کو ناراض کر کے طالبان کی اسلامی ریاست کو تسلیم کر لیا۔نواز شریف نے شریعت بل منظور کروانے کی کوشش کی۔ جاوید نے شریعت بل کا نیا ڈرافٹ بنوایا اور وزیر اعظم نواز شریف سے ملاقات کر کے انہیں بل پیش کیا لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔

وزیر اعظم نواز شریف نے اٹل بہاری واجپائی کو لاہور آنے کی دعوت دی اور یہ دورہ دونوں حریف ملکوں کی دوستی میں مدد و معاون ثابت ہوا لیکن مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں نے اس کو پسند نہیں کیا۔اسی دوران حکومت کو کارگل آپریشن میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان نے ایک قومی اور علاقائی ریاست کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کی۔ پاکستان نے اپنی نظریاتی اساس کو ملحوظ رکھتے ہوئے کئی قومی ریاستوں کی نو آبادیاتی طاقتوں سے آزادی کی خاطر تگ و دو میں

حصہ لیا۔ فلسطین کی آزادی اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ افغانستان سے غیر مسلم حملہ آوروں کی فوجوں کو نکالنے کی خاطر پاکستان نے افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے بعد افغانستان پر ایک دفعہ پھر غیر مسلم حملہ آور ہوئے مگر اس مرتبہ پاکستان نے غیر مسلم حملہ آوروں سے اتحاد کیا اور افغان مسلمانوں کی تباہی کو ہم خاموشی سے دیکھتے ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہم قومی یا وطنی اعتبار سے پاکستانی ہیں اور ''ملّی'' اعتبار سے مسلم؟ گویا ہمارے نزدیک اگر قومی مفاد یا مصلحت عامہ کے تحت ضروری ہو تو ہم کسی مسلم ریاست کے خلاف غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد بھی کر سکتے ہیں؟ اس مسئلے پر ذہن پر الجھاؤ ہے؟ اس کو کیسے دور کیا جائے؟ یہ سوال جاوید اقبال کے ہمیشہ پیش نظر رہے نیز یہ کہ پاکستان دو ''قومی نظریہ'' کی بنیاد پر قائم ہوا۔ کیا پاکستان کے اندر بھی ''دو قومی نظریہ'' کو ایک حقیقت کے طور پر زندہ رکھنا ضروری ہے؟ کیا پاکستان میں ایک قوم آباد ہے یا دو قومیں؟ کیا پاکستان میں مسلم اکثریت کو اپنے تحفظ کی خاطر غیر مسلم اقلیت سے امتیاز روا چاہیے؟

''اپنا گریبان چاک'' میں مختلف ممالک کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے حوالے سے بھی معلومات موجود ہیں مثلاً جاوید اقبال اپنے چین کے سفر کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ چین سے انہیں بہت سے تحفوں اور سوغاتوں کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ بعض اشیا خود خریدی گئیں۔ چین کے بونے درخت آرٹ کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان درختوں کو اوائل عمری میں اس طرح کاٹا جاتا ہے کہ بڑے سیب کا بڑا درخت بھی چھوٹا ہو کر چند انچوں کے سائز کا رہ جاتا ہے اگر اس کی احتیاط نہ کی جائے تو یہ مر جاتا ہے اگر اسے باہر زمین میں گاڑ دیا جائے تو یہ رفتہ رفتہ پورے سائز کا درخت بن جاتا ہے۔ بونے درخت چین میں مہنگے داموں بکتے ہیں۔ دو سو برس پرانے بونے درخت ملک سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں۔ جاوید اقبال چین کے حوالے سے ایک بچی کا ذکر کرتے ہیں:

> ''۔۔۔سات آٹھ سال کی یہ بچی دیوار چین دیکھنے کے موقع پر ہمارے ہمراہ گئی تھی ۔راستے میں میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے پوچھا'' کیا آپ کے ہاتھوں میں ستارے ہیں؟'' مَیں نے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کھول دیئے۔ کہنے

لگی: ''آپ کے ہاتھوں میں ستارے نہیں کیونکہ آپ مزدوری کے لیے اپنے ہاتھ استعمال نہیں کرتے۔'' پھر اس نے اپنے ہاتھ کھول کر مجھے دکھائے جن میں مشقت کے سبب گٹھے پڑے ہوئے تھے۔ مَیں نے پوچھا۔ ''یہ ستارے آپ کے ہاتھوں میں کیسے آ گئے؟'' اُسنے جواب دیا۔ ''مَیں اپنے سکول میں پڑھائی کے بعد روز تین گھنٹے زمین کو گوڈی کرتی ہوں۔ اس میں بھل ڈالتی ہوں، سبزیاں اگاتی ہوں، انہیں پانی دیتی ہوں۔ میرے ہاتھوں میں ستارے اسی مزدوری کا انعام ہیں۔'' (۷)

جاوید اقبال عدلیہ کے حوالے سے مختلف واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے چیف جسٹس بن چکنے کے بعد ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق لاہور تشریف لائے اور گورنر ہاؤس میں مجھے لنچ پر بلایا۔ گورنر جیلانی بھی موجود تھے۔ فرمایا: ''آپ کی کورٹ میں بعض جج صاحبان کے متعلق مَیں نے اچھی خبریں نہیں سنیں۔'' میں نے کہا ''مجھے بتایئے اگر ممکن ہوسکا تو ان کا تدارک کرنے کی کوشش کروں گا۔'' فرمایا: ''مَیں نے سنا ہے کہ ایک جج صاحب کے چلے جانے کے بعد (جنہوں نے اوتھ لینے سے انکار کر دیا تھا) ان کے چیمبر کی الماری سے پچاس ہزار روپے نکلے تھے۔'' میں نے جواب دیا: ''ہر جج کے پاس ٹین کی ایک سیاہ رنگ کی صندوقچی ہوتی ہے جس میں وہ اہم کاغذات یا مسودات رکھتا ہے۔ یہ صندوقچی گھر سے اس کے ساتھ آتی ہے اور جاتے وقت اس کے ساتھ جاتی ہے یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک جج جس نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا ہو، گھر جاتے وقت پچاس ہزار روپے اپنی صندوقچی میں ڈال کر ساتھ لے جانے کی بجائے اپنے چیمبر کی الماری میں چھوڑ جائے گا؟ آپ کو جس کسی نے بھی یہ خبر دی ہے، اس نے جھوٹ بولا ہے۔'' پھر فرمایا: ''ایک جج صاحب کے خلاف یہ شکایت ہے کہ ان کے ذمہ تقریباً ستر

فیصلے ہیں جو ابھی تک تحریر نہیں کیے گئے۔'' مَیں نے جواب دیا ''مَیں اس کے متعلق معلومات حاصل کر کے انشاءاللہ یہ شکایت دور کر دوں گا۔'' (۸)

دسمبر ۱۹۹۹ء میں ڈاکٹر حفیظ ملک پاکستان آئے۔ان کی خواہش پر جاوید اقبال نے دورہ افغانستان کیا کیونکہ وہ ''طالبان'' سے ملنا چاہتے تھے۔کابل کا یہ سفر بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ حملوں کی وجہ سے سڑک بہت خستہ حالت تھی۔کابل پہنچ کر انہیں احساس ہوا کہ ''ناکام ریاست'' کیا ہوتی ہے۔کیونکہ عمارات کھنڈر بن چکی تھیں،محلات، باغات، بازار سب تباہ ہو چکے تھے۔مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر کا مزار گولیوں سے بالکل تباہ کر دیا گیا تھا۔افغانستان کے بادشاہ نادرشاہ کا مزار بھی گولہ باری سے بالکل ایسا ہی تھا۔کابل میں حالات اچھے نہ تھے۔غربت اور افلاس کا یہ عالم تھا کہ کٹی ہوئی ٹانگوں والے بوڑھے، جوان، بچے اور بچیاں سینکڑوں کی تعداد میں بھیک مانگتے پھرتے تھے۔سکول اور کالج بند تھے۔کابل یونیورسٹی بھی ویران پڑی تھی۔جاوید غزنی اور قندھار جانا چاہتے تھے لیکن خطرے کی وجہ سے جانے کی اجازت نہ ملی۔

کابل میں ملا عمر سے تو ان کی ملاقات نہ ہو سکی لیکن کابل کے چیف جسٹس سے ملاقات ہوئی۔جاوید نے اُن سے بہت سے سوالات کیے جن میں سے کچھ وہاں کے قوانین شریعت کے متعلق تھے اور آخری سوال انہوں نے اجتہاد کے متعلق کیا جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔کابل سے واپسی پر انہوں نے اکوڑہ خٹک کے مولانا سمیع الحق سے ملاقات کی۔انہوں نے سمیع الحق کے عالیشان مدرسے کی سیر کی جہاں ہزار کے قریب غریب طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔تعلیم کا کورس چھ سال کا تھا اور رہائش اور خوراک کا انتظام مفت تھا۔یہ مدرسہ صاحب ثروت لوگوں کی مالی امداد سے چلتا تھا۔مولانا سمیع کے اصرار پر جاوید اقبال نے طلباء سے خطاب کیا اور انہوں نے طلباء کو سوال کرنے پر اکسایا کیونکہ سوالات کرنے سے ہی قومیں علم کے میدان میں آگے بڑھتی ہیں۔انہوں نے کہا کہ کسی مسئلے کے حل کو حتمی نہ سمجھیں بلکہ علم کے میدان میں شک سے ابتداء کریں کیونکہ بغاوت ہی سے نئی راہیں کھلتی ہیں اور انقلاب آتے ہیں مدرسے کی کتاب پر انہوں نے علامہ کے چند اشعار تحریر کیے۔

لاہور پہنچ کر ''طالبان'' کے حق میں چند تقریریں کیں اور حکومت پاکستان پر زور دیا کہ ''طالبان'' کی امداد

جاری رکھنی چاہیے کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں۔اس وجہ سے علماء کے وفد جاوید کے پاس آنے لگے جس سے انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ طالبان اور ان کی اسلامیت سے کس قدر متاثر ہیں اور ایسی ہی اسلامیت وہ پاکستان میں رائج کرنا چاہتے تھے۔لیکن انہوں نے علماء کرام پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا کہ ''طالبان'' کی امداد سے مراد افغان حکومت کی امداد ہے یہ مدد دوستی کی وجہ سے ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم افغانی طرز کی اسلامیت نافذ کرلیں۔

جنرل پرویز مشرف نے ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہی بین الاقوامی کمیونٹی کے سامنے پاکستان کا ''لبرل'' یا میانہ رو امیج پیش کرنے کی کوشش کی۔اس کے لیے انہوں نے کبھی مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل قرار دیا اور کبھی ایسے بیان دیئے کہ ''توہینِ رسالت'' قانون کے ناجائز استعمال کو روکنے کے لیے اس کے ضابطہ اطلاق میں ضروری ترامیم کی جائیں گی لیکن علماء کے احتجاج پر اس پر عمل نہیں کیا گیا، بہرحال پاکستان میں مذہبی شدت پسندی روز بروز فروغ پا رہی تھی اور اس کا اظہار فرقہ ورانہ دہشت گردی کی صورت میں رُونما ہو رہا تھا جسے حکومت بھی کنٹرول نہ کر پا رہی تھی۔اس وجہ سے مسجدوں اور امام بارگاہوں میں مسلمانوں کو مسلمان بے دریغ قتل کر رہے تھے عوام بھی آہستہ آہستہ مانوس ہوتی گئی کیونکہ کوئی سنی یا شیعہ عالم درس دے کر گھر واپس جاتے ہوئے موٹر سائیکل سوار دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے یا کسی مسجد یا کلیسا میں عبادت گزار بیسوں کی تعداد میں کلاشنکوف گولیوں یا گرینڈوں کا نشانہ بنیں تو ایسے واقعات کو روزمرہ کا معمول سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا اور دہشت گردی کو ''را'' کی کاروائی سمجھ کر بھلا دیا جاتا۔

حالات کے پس منظر میں جاوید اقبال نے سنجیدگی سے غور کیا کہ بانیان پاکستان نے پاکستان کے لیے کس طرز کا اسلامی ''ماڈل'' تجویز کر رکھا ہے۔ترکی، ایرانی، طالبان یا سعودی عرب کے اسلامی ماڈلوں میں سے کوئی ایک قابلِ قبول ہو سکتا تھا یا ان کی نگاہ میں کوئی بہتر ماڈل تھا۔اسلامیت سے وہ کیا مراد لیتے تھے؟ انہی سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے ''اسلام اور پاکستان کی شناخت'' کے عنوان سے انگریزی میں کتاب لکھنا شروع کی۔اس کو مکمل کرنے میں ڈیڑھ دو برس لگے ۲۰۰۰ء میں ان کی کوئی خاص مصروفیت نہ رہی ایک دفعہ یومِ اقبال کی تقریب کے لیے امریکہ گئے اور دوسری مرتبہ انقرہ گئے جہاں مولانا رومی سے متعلق کانفرنس میں شرکت

کی۔ مقالے کا موضوع شیطان۔ رومی، گوئٹے اور اقبال کے نرغے میں'' تھا۔ یہاں ان سے علامہ کا یہ قول بار بار سنا گیا بدی کی ایک اپنی تعلیمی حیثیت ہے، نیک لوگ عموماً بے وقوف ہوتے ہیں۔

رومی، گوئٹے اور اقبال ان فلسفی شعرا میں سے ہیں جو انسانی ارتقاء کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک انسان کی تخلیق محض کھیل تماشے کے لیے نہیں کی گئی بلکہ حیات کے کئی ارتقائی مراحل سے گزر کر انسان، انسان کے مرحلہ تک پہنچا ہے لیکن جاوید کی نظر میں تو انسان اپنے اندر کے حیوان کو قابو کرنے میں ناکام ہے خدا کے نازل کردہ مذاہب بھی اس حیوان کو قابو نہ کر سکے۔

جاوید اپنی بیوی ناصرہ کی تعریف کرتے ہیں کہ اگر زندگی میں کسی انسان سے زیادہ متاثر ہوئے تو ان کی بیوی ناصرہ ہیں کیونکہ ایک جدید پاکستانی مسلم خاتون کی حیثیت سے وہ ان کی نگاہ میں ''ماڈل'' ہیں۔ وہ ناصرہ کی خصوصیات اور عملی زندگی مَیں ان کے اقدامات کو بہت سراہتے ہیں اور ناصرہ کے خاندان کے کچھ افراد کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جنہوں نے فلاح و بہبود کے کام سرانجام دیے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء میں امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی ہوئی اور اس تباہی کے بعد صدر بش نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور افغانستان کی طالبان حکومت اور ملک کو دہشت گرد قرار دے کر ان پر حملہ کر دیا اور اسے تباہ و برباد کر دیا۔ فرنٹ لائن سٹیٹ ہونے کی حیثیت سے پاکستان پر پریشر ڈالا گیا لیکن پرویز مشرف نے اپنی پوزیشن واضح کی۔

اپریل ۲۰۰۲ء میں مجید نظامی کے یوم ولادت منانے کا اہتمام کیا گیا۔ جاوید ان کو ۱۹۵۵ء سے جانتے تھے جب وہ لندن میں ''نوائے وقت'' کے نمائندے کی حیثیت سے مقیم تھے۔ جاوید نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''مجید نظامی کنزرویٹو (رجعت پسندانہ) قسم کے خیالات رکھتے ہیں اور میں مزاجاً ''لبرل ازم (وسیع النظری) کا حامی ہوں ۔مگر حقیقت میں ہم دونوں اندر سے ایک ہی ہیں۔ آخر میں جب مجید نظامی نے اس کے جواب میں کہا کہ ''نہ میں ''کنزرویٹو'' ہوں اور نہ جاوید اقبال ''لبرل'' ہیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ جاوید اقبال کو علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر بڑا غصہ ہے۔ نیز وہ علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔

جاوید قومی تقریبات میں مزار اقبال پر جانا اس لیے پسند نہیں کرتے کہ وہ سجادہ نشینی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ایک جدید مسلم شاعر و مفکر تھے۔ جو پیری مریدی کی روایت کو مسلمانوں کی تمدنی زوال کا سبب گردانتے ہوئے اس سے متنفر تھے۔ اس لیے جاوید بھی اس چیز کو پسند نہیں کرتے اور جہاں تک آگے نکلنے والی بات ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ علامہ کسی صاحبِ فکر سے آگے بڑھ جانے سے مراد اس کی تحقیر کرنا نہیں بلکہ اس کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے اور اس کے بتائے ہوئے رستہ سے نئی راہیں تلاش کرنا دراصل فکری تسلسل کو آگے بڑھانا ہے۔

جاوید خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ کاش وہ اِن نوجوانوں میں سے ہوتے جو اقبال کی اس ریاست کو عملی طور پر وجود میں لاسکنے کے قابل ہوتے چونکہ ان کی نسل مایوس نسل ہے وہ علامہ کی خواہش کے مطابق جاوید بھی نہ بن سکے۔ جاوید کی نسل نے تو مردِ حق کی رہنمائی میں پاکستان حاصل کرلیا لیکن بعد میں جو بھی حکمران میسر آئے وہ قائم کردہ معیار پر پورے نہیں اترتے تھے لیکن ان کی نسل ابھی تک شجر سے پیوستہ ہے اور بہار کی امید رکھے ہوئے ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک''، (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۴) ص ۸۵، ۸۶

۲۔ ایضاً، ص ۷۴، ۷۵

۳۔ ایضاً، ص ۹۴

۴۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۶۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۷۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۸۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۷۹

☆☆☆

باب چہارم

”اپنا گریباں چاک“ کے بارہ ابواب میں فکر اقبال پر جاوید اقبال کے تبصروں کا خصوصی تحقیقی تجزیہ

جاوید اقبال کی ایک بڑی حیثیت اقبال کے سوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ علامہ کے فکر کے شارح کی بھی ہے۔ ان کی زندگی کے کئی عشرے اقبال کے فکر کی تشریح میں صرف ہوئے۔ انہوں نے زندگی کی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس بارے میں نہ کبھی غفلت کی اور نہ پہلو تہی کی۔ ملک بھر میں اور بیرون ملک جہاں انہیں علامہ اقبال کے حوالے سے منعقد ہونے والی کسی تقریب میں بلایا گیا، وہ گئے اگر ایسی تقریبات کا گوشوارہ ترتیب دیا جائے جن میں انہوں نے علامہ اقبال کے فکر وفن کے حوالے سے لیکچر دیئے مضامین ومقالات پڑھے، ریڈیو، ٹی وی، مختلف تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تقاریب، سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت کی تو ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔

ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے فہم اقبال کو پھیلانے کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے اپنی فراست کے مطابق فکر اقبال کی شرح کی، کئی جگہوں پر ان سے اختلاف بھی کیا گیا تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ فکر اقبال کو ان کی ذہنی مصروفیات میں ہمیشہ ایک خاص حیثیت حاصل رہی۔ اگرچہ ان کی شناخت کا ایک بڑا ذریعہ ان کا ''فرزندِ اقبال'' ہونا بھی ہے جس پر جاوید اقبال کئی بار ناراضی کا اظہار کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے مؤقف میں اس حوالے سے سچے ہیں کہ ان کی شخصیت کے موجودہ قد وقامت میں ان کی اپنی صلاحیتوں اور ریاضت کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے انٹرویو میں بھی بتایا کہ اپنے حوالے سے اپنا مقام اور شناخت پیدا کرنا تو خود اقبال کے فلسفہ خودی کے عین مطابق ہے پھر بھی اقبال شناسوں نے انہیں زیادہ ''فرزند اقبال'' ہی کے تعلق سے پہچانا۔

فرزندِ اقبال ہونے پر غصہ والا قصہ تو ہم باب ششم میں زیر بحث لائیں گے لیکن جہاں تک آگے نکلنے والی

بات ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ علامہ کی فکر سے آگے بڑھ جانے سے مراد اس کی تحقیر کرنا نہیں بلکہ اس کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے اور اس کے بتائے ہوئے راستہ سے نئی راہیں تلاش کرنا دراصل فکری تسلسل کو آگے بڑھانا ہے۔ جہاں تک جاوید کی ذات کا تعلق ہے انہوں نے اپنی ذاتی کاوش کے ذریعے افکار اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی اور گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں مختلف قسم کی تقریبات میں مختلف مقالات پیش کئے جو کہ ایک طرح کا اقبالی تبصرہ تھا لیکن چونکہ وہ انہیں اپنے سیاسی اور ثقافتی ماحول کے ردعمل کے طور پر تحریر کرتے تھے اس لئے وہ ان کے فکری کرب کی عکاسی کیا کرتے تھے۔

فہمِ افکارِ اقبال کے حوالے سے جاوید اقبال کی ذہنی صورتحال کا تجزیہ دلچسپ نتائج کا حامل ہے ''اپنا گریباں چاک'' کے مندرجات کے علاوہ جاوید اقبال کے مختلف مضامین اور مختلف تقاریب ٹی وی کے پروگراموں میں ان کے خیالات کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کے افکار پر مسلسل غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ علامہ اقبال کے حوالے سے ان کے ذہن میں ایک مسلسل کشمکش ہے۔ وہ محبت اور گریز کی مختلف کیفیات سے گزرتے رہتے ہیں اور ان کیفیات کو انہوں نے کبھی چھپایا نہیں وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ اقبال شناسوں کے طعن و ملامت کی پروانہ کرتے ہوئے انہوں نے گزشتہ چار دہائیوں میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنے اختلافی اور تشکیکی خیالات کو کھل کر بیان کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ''اپنا گریباں چاک'' صورت حال کا پہلا اہم دستاویزی ثبوت ہے جس میں انہوں نے اپنی اقبال فہمی کو ایک باضابطہ تحریری شکل دی ہے۔

افکار اقبال کی تفہیم کے حوالے سے جاوید اقبال جس ذہنی کشمکش کا شکار ہیں اس کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں تین طرح کی صورتیں ملتی ہیں۔۔

۱۔ وہ مقامات جہاں جاوید اقبال علامہ اقبال کے افکار سے کھل کر اختلاف کرتے ہیں۔ وہ اقبال کے خیالات پر تشکیک کا اظہار کرتے ہیں انہیں اس بات کی سمجھ نہیں لگتی کہ علامہ نے ایسا کیوں کیا؟ وہ علامہ اقبال کے ایسے افکار کے بارے میں تحفظات Reservations رکھتے ہیں جس کا وہ جگہ جگہ اظہار کرتے ہیں۔ ان

کے خیال میں ایسے مقامات پر علامہ اقبال جمود Rigidity کا شکار ہیں انہیں کچھ لچک کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا۔ انہیں بولتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے خیالات میں کچھ تبدیلی پیدا کرنی چاہئے تھی۔ خصوصاً مغربی اثرات قبول کرنے میں علامہ اقبال نے پرانے خیالات کی وکالت کی، نیا پن قبول کرنے سے گریز کیا۔ ایسے مقامات پر وہ فہم اقبال سے اختلاف کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرے مقامات وہ ہیں جہاں وہ اقبال سے جزوی اختلاف کرتے ہیں اور ان میں مناسب ردّوبدل تجویز کرتے ہیں۔ وہ اپنی رائے اقبال کی رائے سے آمیز کرتے ہیں۔ انہیں اپنے خیال سے ہم آہنگ کرنے کے لئے انہیں اپنے ذہن اور زمانے کے مطابق کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

۳۔ تیسری صورت حال ان مقامات اور افکار کے حوالے سے ہے جہاں وہ افکار اقبال سے متفق ہیں اور ان کی تائید و تحسین کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کی رائے تائیدی نظر آتی ہے اور توثیق و تصدیق کا درجہ رکھتی ہے۔

فہم و افکار اقبال کے حوالے سے جاوید اقبال کی یہ ملی جلی کیفیت ویسے تو پوری کتاب ہی میں نظر آتی ہے لیکن اقبال کے نام خط میں زیادہ نمایاں ہے۔ یہ خط کتاب کے آخر میں ایک جداگانہ مگر اہم باب کا درجہ رکھتا ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' عام سوانح عمریوں سے اس حوالے سے مختلف اور منفرد سوانح عمری ہے کہ اس میں صفحہ صفحہ پر علامہ اقبال جیسی نابغہ اور شہرہ آفاق شخصیت کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ذکر ملتا ہے۔ جاوید اقبال کی ذہنی کشمکش میں علامہ اقبال سے محبت کے باوجود ایک گریز کا پہلو بھی ہے۔ گریز کا پہلو اس اعتبار سے کہ وہ اپنی ذات کے حوالے سے جداگانہ شناخت چاہتے ہیں، لیکن وہ علامہ اقبال کی عظمت سے گریز پا ہوتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر اقبال سے متاثر رہتے ہیں۔

علامہ اقبال نے برسوں جن سوچوں کو جگر کا خون پلایا اور گریہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی سے جن افکار کی آبیاری کی، جاوید ان سے جزوی طور پر اختلاف کرتے ہوئے بھی اس فکری قد و قامت سے محروم نظر آتے ہیں جس کی افکار اقبال سے اختلاف کے لئے ضرورت ہے۔

اقبال نے وطنیت، ملت، خودی، فرنگ، اجتہاد اور دوسرے مسائل و افکار پر برسوں خون جگر صرف کیا

بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ان میں سے کچھ افکار میں ترمیم واضافہ کی بھی گنجائش اور توسیع ہوسکتی ہے۔ اقبالیات کے حوالے سے سینکڑوں اہم کتابیں اور ہزاروں گراں پایہ مقالات ومضامین جواب تک لکھے گئے علامہ اقبال کے فکر کی تفسیر وتوسیع ہی کے ضمن میں لکھے گئے۔ گزشتہ پون صدی علامہ اقبال کے افکار کے مطالعے پر محیط ہے۔ اس عرصے میں اقبال دوستوں اور ان سے اختلاف کرنے والوں نے بھی افکار اقبال پر مسلسل بحث وتنقید کی ہے۔

اردو زبان کے علاوہ انگریزی اور دنیا بھر کی دوسری زبانوں میں بھی کلام اقبال کے تراجم ہوئے اور ان کے افکار کی تشریح کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس سارے سلسلے میں جاوید اقبال کا فہم کہاں کھڑا ہے؟ اقبال شناسی کے حوالے سے جاوید اقبال کی اپنی کنٹری بیوشن (Contribution) ایک اوسط درجے کے اقبال شناس سے زیادہ نہیں۔

جہاں تک ان کے فہم اقبال کا تعلق ہے انہوں نے علامہ اقبال کے فکر وفن پر متعدد مقالات ومضامین لکھے سینکڑوں کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی اور اپنے مضامین وخطبات میں فکر اقبال کی تشریحات پیش کیں یوں انہوں نے افکارِ اقبال کو پھیلانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ اقبال کے حوالے سے وہ متعدد ایجنسیوں اور اداروں سے بھی کسی نہ کسی طور وابستہ رہے ہیں۔ ملکی سطح پر انہوں نے اقبال کی مسلسل ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیا ہے جو گزشتہ پانچ چھ دہائیوں سے جاری ہے۔ انہوں نے ''زندہ رُود'' کے نام سے حیات اقبال پر تین جلدوں پر مشتمل سوانح عمری بھی لکھی ہے۔

علامہ اقبال کے ضمن میں ان کی یہ تمام کارکردگی ان کی اقبال شناسی اور اقبال دوستی کے ذیل میں آتی ہے تشریح وتفسیر اقبال کے باب میں ان کے ریڈیائی لیکچر، تقاریر، ریڈیائی ٹی وی پر مذاکرے اور مقالے بھی علامہ اقبال کے افکار کے حوالے سے ان کی خدمات کا ثبوت ہیں۔ مگر انہوں نے افکار اقبال سے اختلاف بھی کیا اور اپنے روشن خیال ذہن کو کہیں نہیں چھپایا۔ ذیل میں ایسے دونوں مقامات کو دیکھتے ہیں۔ جاوید اقبال انگلستان کے سفر کے دوران اپنی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے والد نے بھی بحری سفر کی پوری روداد تحریر کر رکھی ہے۔ اور میں بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس سفر کی تفصیل بیان کر رہا ہوں۔ لیکن ہم دونوں کے تاثرات اس بارے میں بہت مختلف ہیں۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''ان کے بدن میں ایک نابغہ روزگار مسلم شاعر کا دل دھڑکتا تھا مگر میں شاید فلسفہ کا طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ جذبات وروحانیات سے خالی ایک ایسے دل کا مالک تھا جو میرے جسم میں محض ایک گوشت کے لوتھڑے کی مانند دھڑک رہا تھا۔۔۔(۱)''

سمندر کے نظارے کے بارے میں والد کے تاثرات بیان کرتے ہیں کہ :

''جہاز کے سفر میں دل میں سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوت لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں، ان سے قطعہ نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے۔ جس سے مغرور انسان کو اپنی ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ آج ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح میں بہت سویرے اٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی مدھم پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشمہ آب میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہے جیسے ہمارا دریائے راوی۔ طلوع آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لئے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔(۲)''

جاوید اس سمندری سفر کو اپنے فلسفیانہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

''والد نے آج کل کے ہوائی جہازوں میں سفر نہیں کیا تھا ورنہ فضا میں انہیں خدا کی قوت لامتناہی کا ایک اور ہی قسم کا احساس ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ سمندر کی خوفناک وسعت دیکھ کر مغرور انسان کو اپنے ہیچ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے مگر جن ترقی یافتہ اقوام نے سمندری اور ہوائی جہاز بنا رکھے ہیں ان کے غرور کا باعث تو سمندر یا فضا کی خوفناک وسعت پر ان کی اپنی قدرت ہے۔ بلکہ علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی رفتار اگر اسی طرح قائم رہی تو عین ممکن ہے کہ آئندہ کے ترقی یافتہ ملکوں کے انسان کو خدا کی ضرورت ہی نہ رہے

اور خدایا اس کی قوت لامتناہی کا احساس صرف پسماندہ اقوام تک ہی محدود ہو کر رہ جائے۔
بہر حال میرا ایمان میرے والد کے ایمان سے کمزور ہے۔ اس لئے سمندر کی خوفناک
وسعت کا نظارہ کرتے وقت میرا دل صرف نظارے کے جمال سے متاثر ہوا۔ اس میں
ان کی طرح خدا کی قوت لامتناہی کے جلال کا احساس پیدا نہ ہوا۔'' (۳)

اس طرح لبرل ازم کے حوالے سے وہ اپنے موقف کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

''جدید اسلام میں لبرل ازم کی تحریک اور اقبال'' مختصراً مقالہ میں میرا موقف یہ تھا کہ
اسلام میں ''لبرل ازم'' کی تحریک ہی پاکستان کی نظریاتی اساس فراہم کرتی ہے۔
سردار عبدالرب نشتر کو اصطلاح ''لبرل ازم'' کے معانی سمجھنے میں دقت پیش آئی اور اس
غرض کے لئے شام کو مجھے اپنی رہائش گاہ پر بلایا۔ ملاقات پر میں نے عرض کیا کہ
اصطلاح سے مراد وسیع النظری رواداری اور کسی مخصوص فرقہ یا فقہی مکتبہ فکر کے
نظریات سے بالاتر ہو کر سوچنا اور بذریعہ اجتہاد وقت کی ضروریات کے مطابق
شریعت اسلامی کی تعبیر کرتے ہوئے قانون سازی میں نئے رستے تلاش کرنا ہے۔
پھر میں نے انہیں کیمبرج میں جمیل نشتر پر گوشت اور مرغی کھانے پر ان کی عائد کردہ
پابندی کا حوالہ دیا جو بعد ازاں ہٹا دی گئی۔ وہ میری بات کو سمجھ تو گئے مگر فرمایا کہ اس
تحریک کو ''لبرل ازم'' کے نام سے منسوب کرنے کی کیا ضرورت ہے یہی تو اصل اسلام
ہے۔'' (۴)

جاوید چیزوں میں صرف احساس جمال کو تلاش کرتے ہیں جبکہ اقبال اس میں اللہ کو اور اس کی خوبصورتیوں کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :

''رومی، گوئٹے اور اقبال ان فلسفی شعراء میں سے ہیں جو انسانی ارتقاء کے قائل تھے۔
ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں کی بلکہ

حیات کے کئی ارتقائی مراحل سے گزر کر انسان، انسان کے مرحلہ تک پہنچا ہے۔ اور ابھی اس نے مزید کئی ارتقائی مناظر طے کر کے اس مقام پر پہنچنا ہے، جسے الجیلی ''انسان کامل''، ابن ماجہ ''متوحّد''، رومی ''انسانِ برتر''، نطشے ''مافوق النسان'' اور اقبال ''ہمکارِ خدا'' کا نام دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ میری نگاہ میں تو انسان کے اندر رینگنے والے کیڑے مکوڑے کانٹے دار پودے اور جھاڑیاں اور پرندے خونخوار حیوان وغیرہ یعنی اس کے آباؤ اجداد ابھی تک زندہ موجود ہیں۔ خدا کے نازل کردہ مذاہب یا ادیان بھی اس کے اندر کے حیوان کو مستقلاً زیر نہیں کر سکے۔ مذہبی جبر یا ثقافتی رواداری سب اسے قابو کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس اندر کے حیوان کو بعض لوگ شیطان سمجھتے ہیں مگر شیطان تو اپنے تکبر کی وجہ سے رائندہ درگاہ ہوا۔ انسان کے معتوب ہونے کا باعث تکبر نہیں بلکہ اس کی بھوک اور شہوت تھے۔ بھوک اور شہوت حیوانی خصوصیات ہیں، شیطانی نہیں۔ میرے خیال میں خداوند تعالیٰ کا یہ تجربہ کامیاب نہیں رہا۔

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

(۵)''

''اپنا گریباں چاک'' میں ایک اور جگہ افکار اقبال پر وہ کچھ اس انداز میں تبصرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ میں نے اپنی ذاتی کاوش کے ذریعے افکار اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میری اقبال شناسی دیگر اقبال شناسوں کی طرح کی سی ہے۔ مجھے علامہ اقبال نے اپنی تعلیمات کے متعلق کبھی کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ کیونکہ تب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا اس کے باوجود گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں مرکزیہ مجلس اقبال کے رکن کی حیثیت سے میں ہر سال یوم اقبال کے موقع پر تقاریر کرتا رہا ہوں۔ کئی برس تک یہ خطبات تحریر کر

کے مجمع کے سامنے پڑھے گئے یہ مقالات پاکستان کی سیاسی ثقافتی اور معاشی تاریخ پر ایک طرح کا اقبالی تبصرہ ہوا کرتے تھے۔ چونکہ میں انہیں اپنے سیاسی اور ثقافتی ماحول کے ردعمل کے طور پر تحریر کرتا تھا اس لئے وہ میرے فکری کرب کی عکاسی کرتے تھے۔ شاید اسی سبب ان کی زبان میرے دل کی زبان ہوتی تھی۔''(۶)

ان پیراگرافوں کے علاوہ ''اپنا گریباں چاک'' میں اور کئی جگہوں پر بھی ایسے اقتباسات مل جاتے ہیں جہاں جاوید اقبال کے ذہن وافکار پر علامہ اقبال کے بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرات نظر آتے ہیں:

''میرے والد کو بیت اللہ کا حج نصیب نہ ہوا تھا مگر جذبہ عشق رسول ﷺ کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ساحل عرب کے نزدنے جہاز میں بیٹھے ہوئے بھی ان میں ذوق وشوق کی ایسی گداز کیفیت پیدا کر دی کہ مجھ جیسا عقل کا غلام اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہاں اقبال اور کہاں امیر قوموں کے سہارے جینے والے مجھ جیسے بھکاری مسلمانوں کی محکوم ومجبور نسل۔''(۷)

سفر در اقبال کی ابتدا کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''غالب کی شاعری نے میرے لئے کئی دروازے کھول دیئے۔ چوہدری صاحب نے نہ صرف خزینہ غالب تک پہنچنے کے کلید ثابت ہوئے بلکہ بعد ازاں ''جاوید نامہ'' میں ''خطاب بہ جاوید'' پڑھانے سے ان کی رہبری میں میرے سفر در اقبال کی ابتدا ہوئی یہ میری زندگی کا وہ دور ہے جب میں نے اپنی میراث کو پانے کے لئے تگ ودو شروع کی۔ مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ میری میراث دولت یا جاہ وحشمت نہیں علم ہے علم ہی وہ میراث ہے جو مجھے باپ سے ملی ہے۔''(۸)

فکر اقبال کے حوالے سے انٹرویور اقمہ نے جب وضاحت چاہی تو جاوید اقبال نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا:

''فکر اقبال کے ساتھ میرا link شروع سے رہا ہے ایک تو چوہدری محمد حسین کا اثر بہت غالب رہا ہے۔ دیوان غالب انہوں نے مجھے پڑھائی۔ اس زمانے سے جو روحانی

تعلق میرا ان سے قائم ہوا تو ایک طرح سے میں ان کو باپ زیادہ سمجھتا ہوں۔ انہوں نے جو میری ساخت بنائی بنانے والے وہ ہیں۔ کلام اقبال میں ''جاوید نامہ'' پڑھائی دیوان غالب نے تو میری زندگی بدل دی اسی لئے میں نے ایم اے انگریزی کا ارادہ کیا اور اسی وجہ سے ادب کی طرف راغب ہوا۔''

جاوید اقبال اپنی فکری سفر کی داستان کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ:

''جہاں تک جمال الدین افغانی کا تعلق ہے۔ میرے والد انہیں اسلام کے دور جدید کا مجدد سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلم اقوام کے وفاق کا تصور پیش کیا اور واضح کیا کہ جب تک مسلمان مغرب کے وسائل قوت کو نہ اپنالیں ان کے لئے یورپی امپیریل ازم کو شکست دینا محال ہے۔

میرے سفر کی چھٹی منزل میں یہ تحقیق کرنا مقصود تھا کہ علامہ اقبال کے فلسفہ انفرادی خودی اور اجتماعی خودی کا برصغیر میں مسلم قوم پرستی کی تحریک پر کیا اثر پڑا اس باب میں میں نے فکر اقبال کے سیاسی پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی اور واضح کیا کہ اس فلسفہ نے تحریک پاکستان کے لئے نظریاتی اساس فراہم کرنے میں کیا کردار ادا کیا آخری منزل قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی اسٹریٹجی سے متعلق تھی جو بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی۔

اس فکری سفر کے دوران مجھ پر دو مزید راز کھلے۔ ایک تو یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں دو روئیں ایک دوسرے کے ساتھ متصادم ہوتی رہیں۔ پہلی رو تو اس مکتبہ فکر کی تھی جو ہندو مت میں اسلام کا ادغام عمل میں لانا چاہتا تھا۔ دوسری رو اس مکتبہ فکر سے ظاہر ہوئی جو مسلمانوں کی ملی تنظیم ہندوؤں سے علیحدہ رہ کر اسلام کی بنیادوں پر عمل میں لانے کا خواہشمند تھا۔ قیام پاکستان سے ثابت ہے کہ اس تاریخی تصادم میں بالآخر کونسی رو غالب آئی۔

دوسرا راز جو مجھ پر افشا ہوا وہ یہ تھا کہ جب سے اسلام برصغیر میں وارد ہوا۔ روح اسلام اپنی نمو کی خاطر راہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہیں۔ گزشتہ کئی صدیوں میں کبھی تو اس نے مشاہدے کے ذریعے اور کبھی کشف کے ذریعے اسی کوشش کا اظہار کرنا چاہا۔ کبھی شہنشاہوں کے فرمان کی صورت اختیار کی۔ کبھی علماء کی وساطت سے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا، کبھی مجاہدین کی تلواروں کی راہ سے، کبھی جدید سیاسیاست کے بھیس میں کبھی اتحاد اسلام کے داعی کی ہیت میں، کبھی ادب اور کبھی فلسفہ کی شکل میں، غرضیکہ اس نے مختلف ذرائع اختیار کیے حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں جا کر اسے واضح زبان نصیب ہوئی۔ جب وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں ڈھل گئی اور بالآخر قائداعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں پاکستان کے قیام کی صورت میں اس نے صدیوں کی جدوجہد کے بعد اس مقصد کو پالیا گیا۔''(۹)

آگے چل کر وہ گلڈ کے انتخابات کے حوالے سے اپنی یادداشتوں کا یوں اظہار کرتے ہیں کہ:

''لاہور میں گلڈ کے اربابِ بست وکشاد کے تقرر کے لئے الیکشن بھی ہوئے۔ میں بھی کھڑا ہوا لیکن ادیبوں نے میری بجائے اعجاز بٹالوی کو منتخب کیا۔ میرے خلاف جو بات کی گئی وہ یہ تھی کہ میں اسلام پسندوں کے زمرے میں آتا ہوں اور سوشلسٹ نہیں ہوں۔ میرے ساتھ زندگی میں ہمیشہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ''اصلی اور خالص'' اسلام پسند تو مجھے ملحد سمجھتے ہیں اور ملحد دہریے اور سوشلسٹ دانشور مجھے اسلام پسندوں میں شمار کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جو شعر اپنے بارے میں ارشاد کر رکھا ہے اس کا اطلاق مجھ پر بھی ویسے ہی ہوتا رہا ہے۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

"(۱۰)

انہوں نے نظریہ پاکستان کے حوالے سے بھی اپنی تجاویز کا ذکر کیا۔ ان کے خیال میں نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لئے کسی مذہبی ادارے کا قیام ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''کتاب میں نظریہ پاکستان کے عملی نفاذ کے ضمن میں اور تجاویز کے علاوہ ایک اہم تجویز یہ تھی کہ وزارت مذہبی امور قائم کی جائے جو پاکستان بھر کی نہ صرف مساجد کو کنٹرول کرے۔ بلکہ مستند یونیورسٹی کی فیکلٹی دینیات کے سند یافتہ آئمہ مساجد کا تقرر بھی کرے اس تجویز پر اگر عمل کیا جاتا تو علامہ اقبال کے تصّور کے مطابق دین ملکی سیاست سے جدا ہونے کی بجائے اس کے ساتھ وابستہ ہوجاتا اور عین ممکن ہے کہ پاکستان میں فرقہ واریت کے فروغ کے سبب ''دین ملاّ فی سبیل اللہ فساد'' والی کیفیت پیدا نہ ہوتی۔''(۱۱)

مسجد قرطبہ کی زیارت کے بارے میں ان کے شوق اور والہانہ پن کا اندازہ ان کی تحریر کے لفظ لفظ سے پھوٹتا ہے۔ جوانہوں نے مسجد قرطبہ دیکھنے کے اشتیاق کے حوالے سے لکھی ملاحظہ فرمائیں:

''میرا دل تو رات ہی کو مسجد قرطبہ کے اندر جانے کے لئے بیتاب تھا۔ لیکن مسجد کلیسا کے سب دروازے بند تھے۔ اور ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی اس تاریکی میں ہم نے مسجد کا طواف کیا اور بعد ازاں سونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گئے۔ ہم دونوں دن بھر کے سفر کے سبب بہت تھکے ہوئے تھے۔ میں نے سردار اقبال کو اندلس میں مسلمانوں کے عروج وزوال اور خصوصی طور پر قرطبہ کی تاریخ کے متعلق بتانا شروع کیا، میں بولتا چلا گیا اور سردار اقبال سو گئے۔ مگر میں بڑی بے چینی کے عالم میں تھا مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رہ رہ کر مجھے اپنے والد کے آخری ایام کا خیال آ رہا تھا انہیں بھی نیند نہ آتی تھی۔ ''نیند نہیں آ رہی!'' وقت نہیں گزر رہا۔ نیازی صاحب! کوئی کہانی سنایئے جس میں اندلس کا ذکر ہو۔ شاید نیند آ جائے''۔ نذیر نیازی کی کہانی سنتے سنتے کبھی کبھار انہیں نیند آ جایا کرتی اور بچوں کی طرح اطمینان سے سو جاتے مگر اکثر اوقات نیند نہ آتی تھی۔ وقت کاٹنا دوبھر

ہو جاتا تھا۔ بہت بے چین ہوتے۔ ایسی ہی بے چینی کے عالم میں رخصت ہوئے۔
اگلے دن صبح صبح ہم مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ عام مساجد کی طرح وہ روشن نہ تھی بلکہ کلیساؤں کی طرح اس میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے
عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!
(۱۲)"

''مسجد قرطبہ'' کے بارے میں راقمہ نے انٹرویو میں ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ:
'میں قرطبہ دو دفعہ گیا ہوں۔ ایک دفعہ جب سردار اقبال کے ساتھ ہم گئے۔ دوسری دفعہ جب اس صدی کی سب سے بڑی اقبال کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس قرطبہ میں منعقد ہوئی۔ اس میں پیسہ دینے والا تو کویت تھا انتظام کرنے والا پروفیسر تھا۔President of Pakistan نے جانا تھا لیکن وہ جا نہ سکے تو پھر میں نے کانفرنس اٹینڈ کی۔ یہ وہیں ہوئی جہاں اقبال کی نے نماز پڑھی تھی۔
سب سے پہلے میں نے مسجد قرطبہ پر اقبال کی اردو کی نظم پڑھی۔ میرے بعد یہ ہسپانوی زبان میں پڑھی گئی اور جس نے ہسپانوی میں اس کا ترجمہ کیا تھا وہ خاتون میکسیکن تھیں پھر فرنچ میں فارسی اور پھر عربی میں اس کا ترجمہ پڑھا گیا اس میں کوئی تقریر نہیں ہوئی تھی صرف اس نظم کا ترجمہ مختلف زبانوں میں پڑھا گیا۔ پھر اس کے

بعد کانفرنس شروع ہوئی۔

قرۃ العین حیدر نے کیا خوب کہا تھا کہ اردو نظم ابھی تک ''سلسلۂ روز وشب'' سے آگے نہیں بڑھی۔

جب ہم سردار اقبال کے ساتھ پہلی دفعہ قرطبہ گئے تو جب بس پہنچی تو رات کے نو یا ساڑھے نو کا ٹائم تھا۔ مسجد کے سامنے میں والے ہوٹل میں ہم ٹھہرے اور سردار اقبال نے دیکھا کہ مسجد کے دروازے بند تھے۔ وہ تو اب کلیسا ہے اس لئے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ ہم باہر سے طواف کر کے آئے تو تھکے ہوئے تھے سو گئے۔ واپس آئے تو سردار صاحب نے پوچھا کہ قرطبہ کیا ہے؟ یہ مسجد کیسے بنی؟ وہ اس دوران سو جاتے تھے اس وقت مجھے علامہ صاحب کا خیال آیا وہ جس وقت بے چینی کے عالم میں ہوتے تھے تو نذیر نیازی جو پاس بیٹھے ہوتے تھے تو علامہ انہیں کہتے تھے کہ کوئی داستان سناؤ جس میں اندلس کا ذکر ہو مجھے نیند نہیں آ رہی۔

ثمینہ: سر یہ واقعہ آپ کی کتاب میں بھی پڑھا تھا لیکن آپ کی زبانی سن کر اور آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر Feelings اور Strong ہو گئی ہیں۔"

جاوید اقبال عمرے کی غرض سے جب مکہ معظّمہ جاتے ہیں تو وہاں جا کر اس سرزمین کا نظارہ کرتے ہی والد کی اس سرزمین کے لئے محبت کی یاد آتی ہے تو وہ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میڈرڈ سے ہم ہوائی جہاز کے ذریعہ عمرے کی غرض سے رات گئے جدہ پہنچے۔ احرام باندھے اور موٹر کار پر مکہ معظّمہ روانہ ہو گئے۔ فجر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کی پھر عمرہ کیا، لیکن سارا وقت میرے ذہن میں یہی سوال گھومتا رہا'' یہاں اتنی روشنی کیوں؟ وہاں اتنا اندھیرا کیوں؟'' دسرے روز مدینہ منورہ پہنچے، لیکن میری بے چینی میں کمی واقع نہ ہوئی۔'' میرے والد یہاں پہنچنے کے لئے ترستے مر گئے، انہیں نہیں بلایا،

کیوں؟ مجھے بلا لیا، کس لئے؟'' واپس لاہور آ کر میں نے آغا شورش کو بتایا کہ میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ وہ رو دیئے فرمایا: ''عاشقوں کو نہیں بلایا کرتے۔'' (۱۳)

۱۹۷۸ء میں جاوید اقبال اور ان کی بیوی ناصرہ مولانا روم کی برسی کے موقع پر حکومت ترکی کی دعوت پر ترکی گئے اس کانفرنس میں ان کے مقالے کا موضوع ''رومی کا تصور شیطان'' تھا۔ اس موقع پر ان کے اس نکتے کو بہت پسند کیا گیا۔ بقول جاوید اقبال:

''قوموں کو لڑانے کی خاطر بعض اوقات شیطان سیاستدانوں سے کام لیتا ہے۔'' (۱۴)

مقالے میں جاوید اقبال کی جس بات کو خصوصاً پسند کیا گیا وہ یہ تھی۔

''رومی، گوئٹے اور اقبال کے نزدیک انسان کے اخلاقی ارتقاء کے لئے خدا کا شیطان کو وجود میں لانا اشد ضروری تھا۔ اس اعتبار سے شر ہی کے ذریعے خیر کا ارتقا ممکن ہے اور علامہ اقبال تو شیطان کو خدا کا راز دان سمجھتے ہیں۔ (۱۵)''

''جامع الازہر میں شریعت میں ٹیکس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ:

جامع الازہر کے ریکٹر سے میں نے علامہ اقبال کے شعر

جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کا حوالہ دے کر پوچھا کہ کیا شریعت کی رو سے جو مال زائد ہو اسے حکومت ٹیکس کی صورت میں مجھ سے رفاہ عامہ پر صرف کرنے کی خاطر وصول کر سکتی ہے؟ ان کا جواب تھا ''نہیں اضافی مال صرف رضا کارانہ طور پر ہی دیا جا سکتا ہے'' میں نے انہیں بتایا کہ مسلم ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کی موجودگی میں تو کوئی بھی شخص ایک پائی بھی رضا کارانہ طور پر ادا کرنے کو تیار نہ ہوگا۔ اس لئے رفاہ عامہ کی خاطر کسی حد تک ریاستی جبر استعمال کرنے کو علامہ اقبال غیر معقول نہ سمجھتے تھے۔ وہ تو امیروں کو مسجد میں دیکھنے تک کے روادار نہ تھے۔

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو"
(۱۶)

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ جاوید اقبال پر علامہ اقبال کے اثرات اور جاوید اقبال کی سوانح عمری "اپنا گریباں چاک" میں جاوید اقبال کی ذہنی تشکیل میں علامہ اقبال کے اثرات کے تذکار میں کچھ فرق ہے۔ ہم نے یہاں "اپنا گریباں چاک" کے حوالے سے جاوید اقبال پر فہم اقبال کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اسے اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

ان اقتباسات کے علاوہ جاوید اقبال کے افکارِ اقبال پر تبصرے "اپنا گریباں چاک" میں مختلف صفحات پر نظر آتے ہیں۔ مثلاً

۱۹۴، ۲۲۰، ۲۰۸، ۲۱۲، ۲۳۱، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۷، ۲۳۶، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۵۴، ۲۶۷۔

فرزندِ اقبال ہوتے ہوئے بھی جاوید اقبال نے ایک آزادانہ زندگی گزاری اور وہ اپنے لائف سٹائل میں روشن خیال اور جدید زمانے کے فرد رہے۔ انہوں نے جگہ جگہ اس بے باکی کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک علامہ اقبال پر جاوید اقبال کے استفسارات اور اعتراضات کا سوال ہے جاوید اقبال نے انہیں "دوسرا خط" میں شامل کر دیا ہے جس کا جائزہ ہم الگ سے لے رہے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک''، (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۴ء) ص ۶۷

۲۔ ایضاً، ص ۶۷

۳۔ ایضاً، ص ۶۸

۴، ایضاً، ص ۹۲

۵۔ ایضاً، ص ۲۵۶

۶۔ ایضاً، ص ۲۶۸

۷۔ ایضاً، ص ۶۹

۸۔ ایضاً، ص ۵۱

۹۔ ایضاً، ص ۷۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۸، ۱۵۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹۳

☆☆☆

باب پنجم

(ا) ''دوسرا خط'' کا توضیحی جائزہ

(ب) ''خود کلامی'' کا توضیحی جائزہ

(الف)

''دوسرا خط'' کا توضیحی جائزہ

جاوید اقبال کی سوانح عمری کے آخر میں علامہ اقبال کے نام ''دوسرا خط'' کئی بحثوں کے دروازے وا کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے نام جاوید نے ایک خط بچپن میں لکھا تھا۔ جو بچپن کی آرزوؤں اور معصومیت سے عبارت تھا۔

یہ ''دوسرا خط'' انہوں نے علامہ اقبال کی وفات کے قریباً ساٹھ پینسٹھ سال بعد لکھا۔ اپنے مندرجات کے حوالے سے یہ خط جاوید اقبال کے کئی ایسے ذہنی تحفظات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو وہ علامہ اقبال کے افکار کے حوالے سے رکھتے ہیں۔ یہ ذہنی تحفظات کئی ایسے سوالوں کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ جن کے جوابات آج کی نسل کی طرح جاوید اقبال کو بھی مطلوب ہیں۔

چاہئے تو یہ تھا کہ جہاں جاوید اقبال کی اب تک کی زندگی (قریباً ۸۰ سال) کا سفر ختم ہوتا ہے، وہاں انہیں اپنے خیالات و افکار کے حوالے سے بعض ایسے نتائج کا اظہار کرنا تھا جو علامہ اقبال کے افکار سے پیدا ہوتے ہیں اور جن پر جاوید اقبال نے بھی عمر بھر غور و خوض کیا۔ زمانے میں آگے بڑھنے اور نت نئے مسائل پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے افکار بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ کیا تبدیلی چاہتے ہیں؟ نئے زمانے میں علامہ اقبال کے نتائج فکر اور افکار و خیالات پر کسی تازہ بحث کا دروازہ کھلنا چاہئے یا نہیں۔ کیا عمرانیات، سیاسیات، اور مذہب و معاشرت سے متعلق علامہ اقبال کے افکار آج بھی ویسی ہی حیثیت رکھتے ہیں جیسے ان کی زندگی میں رکھتے تھے یا آج ہمیں ان افکار کا جائزہ از سر نو لینا ہوگا۔؟

بہتر تو یہ تھا کہ جاوید اقبال علامہ کے افکار پر اپنی بھرپور رائے دیتے اور اس نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ''اقبالیات'' کے موضوعات پر ہونے والے کام کی روشنی میں ان سوالات کا جواب ڈھونڈتے!

دراصل جاوید اقبال کے یہ سوالات اپنے آپ سے بھی ہیں؟ اور اقبال شناس اور اقبال دوست تمام دانشوروں سے بھی ان سوالات کے جواب ایک اجتہادی رویّہ چاہتے ہیں۔ ایک حوالے سے یہ خط خود کلامی بھی ہے۔ جاوید اقبال نے حقیقت میں تخیل کی آمیزش کر کے اپنی سوانح عمری کا اختتام علامہ اقبال سے استفسار کی صورت میں کیا ہے۔؟

عام طور پر سوانح عمریاں اس انداز میں ختم نہیں کی جاتیں۔ سوانح نگار اپنے حالات زندگی لکھتے ہوئے اپنی زندگی کے تجربات اور نچوڑ کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ اور آئندہ کے امکانات پر روشنی ڈالتا ہوا اپنے قارئین سے رخصت ہوتا ہے۔ مگر یہاں جاوید اقبال نے اپنی سوانح عمری کا اختتام علامہ اقبال کے افکار کے حوالے سے کیا ہے۔

یہ خط ایک تصوّر اور تخیل پر مشتمل ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ علامہ اقبال ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے، جاوید اقبال نے مختلف افکار اقبال کو از سر نو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ خود ان سوالات کے جواب ڈھونڈتے، چاہے اقبال سے اختلاف کرتے کلّی یا جزوی۔۔۔۔ جاوید اقبال تو دانشور ہیں انہوں نے حتی المقدور ''اپنا گریباں چاک'' میں افکار اقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں بھی انہیں مربوط انداز میں افکار اقبال پر اٹھائے گئے سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرنا چاہئے تھی۔

انہوں نے ''مئے لالہ فام'' اور ''زندہ رود'' کے حوالے سے بلاشبہ فکر اقبال کو محفوظ کیا حیات اقبال کے لئے نئے گوشے بے نقاب کئے مگر ان کا سارا کام اقبالیات کے ذیل میں کسی اجتہادی پیش رفت کا واضح عنوان نہ بن سکا انہوں نے دوسرا خط میں جو سوالات اٹھائے وہ فہم اقبال کے حوالے سے ان کے خیالات کا خلاصہ ہیں۔

بہر حال آیئے اس خط کے مندرجات کا جائزہ لیں۔

> جاوید اقبال نے تقریباً سات برس کی عمر میں پہلا خط لکھا تھا۔ جب انہیں انگلستان سے گراموفون باجا لانے کی فرمائش کی تھی۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد دوسرا خط علامہ کو لکھ رہے ہیں جس کا مقصد اپنے قومی تشخص اور ''اسلامی'' ریاست کے بارے میں رہبری لینا ہے۔ جاوید علامہ سے چند سوال کرتے ہیں۔ جن میں پہلا سوال قومی تشخص کے متعلق ہے۔ جس میں وہ مولانا حسین احمد مدنی سے علامہ کی جو بحث ہوئی

اپنی نظریاتی اساس کوملحوظ رکھتے ہوئے کئی قومی ریاستوں کی نوآبادیاتی طاقتوں سے آزادی کی خاطر تگ ودو میں حصہ لیا۔ فلسطین کی آزادی اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کوشیش جاری رکھیں۔ افغانستان سے غیر مسلم حملہ آوروں کی فوجوں کونکالنے کی خاطر پاکستان نے افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے بعد افغانستان پر ایک دفعہ پھر غیر مسلم حملہ آور ہوئے مگر اس مرتبہ پاکستان نے غیر مسلم حملہ آوروں سے اتحاد کیا اور افغان مسلمانوں کی تباہی کو ہم خاموشی سے دیکھتے ہے۔

اس لیے ثابت ہوا کہ ہم قومی یا وطنی اعتبار سے پاکستانی ہیں اور ''ملی'' اعتبار سے مسلم؟ گویا ہمارے نزدیک اگر قومی مفاد یا مصلحت عامہ کے تحت ضروری ہوتو ہم کسی مسلم ریاست کے خلاف غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد بھی کر سکتے ہیں؟ اس مسئلے پر ذہن پر الجھاؤ ہے؟ اس کو کیسے دور کیا جائے؟

اس الجھن کو دور کرنے کے لئے راقمہ نے انٹرویو میں وضاحت چاہی تو انہوں نے کہا کہ:

''پاکستان بننے کے بعد آپ کی جغرافیائی ساخت قومی ساخت سے منسلک ہوگئی۔ آپ کے ہاں قوم پہلے وجود میں آئی' قوم اسلام کے نام پر آئی وطن بعد میں۔ قوم کے لئے آپ نے وطن تلاش کیا ہے اب جبکہ وطن بن گیا تو اب آپ کی شناخت ''اسلام ''قومیت دراصل ہے Territory سے منسلک ہوگئی سو جب Territory سے قومیت منسلک ہو جائے تو وہ Nationalism بنیادی طور پر جغرافیائی ہو جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ مسئلہ ''علمی'' یا ''روحانی'' رہتا یکساں ''روحانی مطمع نظر'' آپ کی Unity کا باعث بنا ''من حیث القوم'' قوم جو ہے مغربی اصطلاح کے مطابق یا نئی اصطلاح کے مطابق لسانی، نسلی اور جغرافیائی' ان تین چیزوں کا اکٹھا ہونا ''قوم'' بناتا ہے۔ United Nation کا ممبر بننے کے لئے عملی طور پر ان تین شرائط کا ہونا ضروری ہے وہی ریاست United nation کی ممبر بن سکتی ہے جو قومی ہو جغرافیائی ہو، مقتدر یعنی National Soverign and Territory ہو۔

اب جب آپ کی قومیت بھی داخل ہوگئی Soverign بھی ہوگئی Territory بھی ہوگئی ۔جب یہ تینوں چیزیں اکٹھی ہوجاتی ہیں تو ان میں سب سے Dominating Element جغرافیائی Aspect ہے۔

اس کی جو جسمانی شکل ہے اس میں تو ''اسلام'' صرف روح ہی رہ گیا نا اب روح کی حفاظت یا زندہ رہنے کے لئے آپ ''جسم'' کو Protect کرتے ہیں کہ نہیں ۔؟ بیماری کی حالت میں یا کوئی آپ پر حملہ کرے تو اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں نا؟ جسم کو بچا رہے ہیں یا روح کو بچا رہے ہیں۔؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ Territory ہوگئی۔اس کا تحفظ کرنا ایک طرح سے اپنی روح کا تحفظ کرنا یا مذہب کا تحفظ کرنا ہوگیا۔

اس فقرے پر ہی میں نے علامہ اقبال کو یہ سوال کیا ہوا ہے کہ اب آپ کے اور حسین احمد مدنی کے اختلاف کی گنجائش کہاں رہی؟ اس کا جواب اقبال یہی دیں گے کہ اس وقت ہم Nation کی تعمیر کے مرحلے میں تھے۔ابھی وطن حاصل نہیں کیا تھا۔جب وطن حاصل کرلیا تو پھر تم ٹھیک ہو۔''

پاکستان ''دوقومی نظریہ'' کی بنیاد پر قائم ہوا۔کیا پاکستان کے اندر بھی ''دوقومی نظریہ'' کو ایک حقیقت کے طور پر زندہ رکھنا ضروری ہے؟ کیا پاکستان میں ایک قوم آباد ہے یا دو قومیں؟ کیا پاکستان میں مسلم اکثریت کو اپنے تحفظ کی خاطر غیر مسلم اقلیت سے دور رہنا چاہیے؟

''علیحدہ نیابت'' کا اصول برصغیر میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر نافذ کیا گیا لیکن اگر صوبوں کی تقسیم جماعتوں کے مذہبی اور تمدنی رجحانات کو مدنظر رکھ کر کی جائے تو مسلمانوں کو خالصتاً ''مخلوط'' انتخابات پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔اس لیے اگر وقت کے بدلتے تقاضوں کے تحت قومی ہم آہنگی برقرار رکھنے کی خاطر مخلوط انتخابات کا نظام رائج کر دیا جائے یا پاکستانی قومیت اور وطنیت کے جذبات کو فروغ دینے کی خاطر مثبت اقدام اٹھائے جائیں

تو کیا پاکستان ''اسلامی'' مملکت سے ''سیکولر'' ریاست میں منتقل ہو جائے گا؟

اقبال کے بارے میں قائداعظم محمد علی جناح نے ارشاد فرمایا تھا کہ علامہ اقبال ان چند ہستیوں میں سے ایک تھے جو مسلمانانِ برصغیر کے قدیم اوطان میں ''اسلامی ریاست'' قائم کرنا چاہتے تھے۔ آج ہمارے سامنے اس کے کئی ماڈل ہیں مثلاً ترکی، سعودی، ایرانی یا سابقہ طالبان ماڈل۔ اس طرح تاریخ اسلام میں خلفائے راشدین کے عہد سے لے کر ترکی میں خلافت کے خاتمے تک (۶۳۲ تا ۱۹۲۴ء) کئی ماڈل نظر آتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ دراصل اسلامی ریاست کی کوئی حتمی شکل نہیں ہے بلکہ مختلف شکلوں میں مسلسل وجود میں آتے رہنے کے عمل کا نام ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلم ریاست کبھی مکمل صورت میں وجود میں آئی ہے۔ مسلم ریاست ایک آئیڈیل ہے جس کے حصول کے لیے ہر مسلم ریاست کو اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہیں۔ کیا یہ سوچ درست ہے؟ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے اسلامی ریاست کے سیاسی اور قانونی ڈھانچے کو سمجھنے کے لیے ان کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے؟

نبی ﷺ کے زمانے کی اسلامی ریاست کے سیاسی ڈھانچہ یا دستور کی ایک تحریری مثال جو ہمیں ملتی ہے وہ ''میثاق مدینہ'' ہے کیا بنیادی طور پر معاشرتی معاہدہ نہ تھا؟

اس پس منظر میں جاوید علامہ اقبال کا ماڈل اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے کہ علامہ نے جمہوریت اور خاص طور پر مغربی جمہوریت پر اعتراض کیا لیکن جب علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے علامہ سے سوال کیا کہ آپ جمہوریت کی موجودہ شکل کو اس کی خامیوں پر اعتراضات کرنے کے باوجود کیوں قبول کرتے ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ اس کا نعم البدل آمریت یا مطلق العنانیت ہے جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔

اگر اسلامی جمہوریت کا تصور ہم ''شوریٰ'' کی آیت سے لیں تو امام کو صرف مشورہ دینا ہے لیکن امام اس مشورہ کا پابند نہیں۔ اس کی مرضی ہے مشورہ قبول کرے یا رد کرے۔ مسلمانوں کی جدید تاریخ میں سید جمال الدین افغانی پہلی شخصیت تھے جنہوں نے ترکی میں سلطان (خلیفہ) عبدالحمید کو شوریٰ یا اسمبلی کے مشورے کا پابند کرنے کو کوشش کی۔ یعنی ''آئینی یا دستوری خلافت'' کا تصور پیش کیا جو وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق نیا اجتہاد تھا۔

لیکن سلطان عبدالحمید نے اُن کے خلاف شیخ الاسلام سے کفر کا فتویٰ جاری کروادیا۔اس لیے والد محترم اگر آپ سید جمال الدین افغانی کو موجودہ عہد کا مجدد سمجھتے تھے۔کیونکہ آپ نے جب ۱۹۲۴ء میں ترکی میں خلافت میں منسوخ ہوگئی تو ترکوں کے اجتہاد خلیفہ کے تمام اختیارات منتخب مسلم اسمبلی کو منتقل ہوگئے تو آپ نے تائید کی تو یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ آپ کی جدید اسلامی ریاست عوام کے ووٹوں کے ذریعے منتخب نمائندوں کی مجلس قانوں ساز کے قیام، حقوق انسانی کے تحفظ اور قانون کی بالادستی کے اصولوں پر ہی قائم ہوسکتی ہے؟

آپ کے نزدیک ''توحید'' کا مطلب انسانی اتحاد، مساوات اور آزادی کی بنیادی پر زمان ومکان کے اندر ایک مثالی معاشرہ وجود میں لانا ہے۔آپ نے کہا کہ اسلام کا اصل مقصد ''روحانی جمہوریت'' کا قیام ہے۔لیکن آپ نے وضاحت نہیں کی کہ ''روحانی جمہوریت'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا اس تصور کی بنیاد ''میثاقِ مدینہ'' پر رکھتے ہیں یا سورۃ ۵ آیت ۵۸ پر جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو تلقین کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے نیک کام انجام دینے میں سبقت حاصل کرو اور یہ کہ جب تم سب اللہ کے روبرو لائے جاؤ گے تو وہ بتائیں گے کہ تمہارے آپس میں اختلافات کیا تھے؟

وضاحت کی عدم موجودگی کے سبب بعض اقبال شناس ''روحانی جمہوریت'' کو صرف مختلف مسلم فرقوں میں رواداری تک محدود رکھتے ہیں اور اس میں غیر مسلموں کو شریک نہیں کرتے۔اس لیے دین کی وہ کونسی تعبیر ہے جو ریاست کو معاشی ناانصافی اور ظلم سے محفوظ رکھتی ہے؟ اور وہ کونسی تعبیر ہے جو شر اور فساد کا سبب بنتی ہے؟ نیز جو تعبیر شر اور فساد کا باعث بنتی ہے اس کے تدارک کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کی اس تجویز کو پسند کیا جاتا ہے کہ ریاست کے مختلف شعبوں سے دینیات کا شعبہ الگ کردیا جائے۔اس شعبہ کا کام مساجد کو کنٹرول کرنا، مدرسوں کے لیے جدید نصاب کا تعین کرنا اور انہیں یونیورسٹیوں سے منسلک کرنا۔اسی طرح صرف حکومت کے سند یافتہ آئمہ مساجد کا تقرر اس شعبہ کی ذمہ داری ہو۔ترکی میں جب یہ اصلاحات نافذ کی گئیں تو اقبال نے بڑے جوش وخروش سے ان کا خیر مقدم کیا اور خواہش ظاہر کی اگر انہیں اختیار حاصل ہوتا تو وہ انہیں انڈیا میں نافذ کردیتے۔

اسی طرح دین کو کیسے ملکی سیاست کے ساتھ پیوستہ کیا جائے کہ ریاست ظلم اور معاشرتی ناانصافی کرنے سے باز رہے؟ منتخب مسلم قانون ساز اداروں یا اسمبلیوں کو ''اجتہاد'' کا اختیار دینے کا تعلق کا ہے۔ آج کی نومسلم اسمبلیوں کے ارکان میں سے زیادہ تر علمی یا تعلیمی اعتبار سے نا اہل ہیں۔ اس لیے علماء کے ایسے بورڈ نامزد کیے جائیں جو ان ارکان کی رہبری کریں۔ اس کے علاوہ قانون کی تعلیم دینے والے اداروں، لاء کالجوں وغیرہ میں نصاب کی اصلاح کی جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہاں ایسے اچھے علماء موجود ہیں جو ارکان اسمبلی کی مثبت رہنمائی کر سکیں؟

کیونکہ جاوید کے ذاتی تجربے میں علماء کرام فرقوں کی وجہ سے مار کٹائی تک پہنچ جاتے ہیں اور ان کے بیانات میں بھی اتنا تضاد ہوتا کہ نتیجہ تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاکستان ایک ''قومی ریاست'' ہے اگر یہاں کی اسمبلیاں اجتہاد کا طریقہ اختیار کرتی ہیں تو ایسے نئے اسلامی قوانین کا اطلاق صرف پاکستان کی سرحدوں تک ہوگا یا پھر فقہ کا ایک نیا ''نیشنل'' مدرسہ وجود میں نہ آئے گا؟

جاوید علامہ سے سوال کرتے ہیں کہ انہوں نے اسلامی قوانین کے بارے میں زیادہ زور اسلامی اخلاقیات کی تربیت پر دیا ہے۔ اس لیے نماز، روزے کی پابندی کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، رواداری حلم، عجز سادگی تجسس جیسی خصوصیات طلباء میں پیدا کرنی ضروری ہیں تا کہ وہ اپنی معلومات کے ذریعے نئی نئی چیزیں ایجاد کریں۔

تاہم اجتہاد کے بارے میں وہ علامہ سے وضاحت طلب کرتے ہیں کیونکہ علامہ نے ایک دفعہ کہا ہماری قوم کو اس وقت اجتہاد کی نہیں اتحاد کی ضرورت ہے۔ علامہ کی تحریروں سے ثبوت ملتا ہے کہ وہ اجتہاد کے قائل تھے مثلاً وہ مسلمانوں میں فری مارکیٹ اکانومی کے فروغ کی خاطر بینکوں کے منافع کو ربوٰ کے زمرے میں نہیں لاتے وغیرہ۔ اس کے علاوہ کریمنل لاء کے متعلق انہوں نے کہا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ انہیں سخت قوانین کی سخت پابندی کریں۔

''اجتہاد'' کے بارے میں جب راقمہ نے انٹرویو میں ان سے وضاحت چاہی تو انہوں نے کہا کہ:

''میں اجتہاد نہیں کرسکتا پچھلے دنوں اس مسئلے پر میری بحث ہوئی ہے۔ یوم تاسیس منایا ہے Islamic Advisary Council میں اس کے جو چیئرمین ہیں پروفیسر ڈاکٹر خالد مسعود۔ ان کی خود بھی ''اجتہاد'' پر کتاب ہے عربی کے سکالر ہیں ان سے میں نے گزارش کی تھی کہ میرا عربی پر عبور نہیں ہے اور علامہ کو بھی نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ اس پہ کچھ کریں خاص طور پر علامہ کی جو Desire تھی کہ وہ ''فقہ کی تاریخ لکھی جائے'' تو یہ کس طرح اسلامی فقہ Develop ہوئی ہے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے شاگرد ہیں (ڈاکٹر صاحب فوت ہوگئے ہیں) آپ اندازہ کریں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے شاگرد ہیں جنہوں نے انڈونیشیا میں نئی فقہ کی ترتیب دی ہے۔ وہاں ان کے ہاں اسلامی قانون وراثت ہے۔ اس کے تحت بہن وراثت میں برابر کا حصہ لیتی ہے یعنی بھائی کے برابر کا اور اسی طرح نئی فقہ کے تحت بین المذاہب نکاح جائز قرار دیا گیا ہے یعنی اہل کتاب کے ساتھ پہلے مرد شادی کرسکتا تھا اب عورت بھی شادی کرسکتی ہے۔

جاوید غامدی صاحب کا یہ View ہے۔ یہاں بھی اس کا اطلاق ہونا چاہئے لیکن لوگوں کا اختلاف ہے۔ غامدی صاحب میرے دوست ہیں ہمارا آپس میں اختلاف بھی رہتا ہے۔ جو نئی چیزیں اس میں آئی ہیں وہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ایک شاگرد ہیں جو اقبال کے مداح بھی ہیں انہوں نے اس پر کام کیا ہے۔ جن کو مفتی اعظم بوسنیا بھی کہتے ہیں۔

اس پارلیمنٹ سے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ ''اجتہاد'' کرسکے۔ اس Parlement سے کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ نہ ہی پارلیمنٹ اور نہ ہی علماء اس قابل ہیں کہ وہ رہبری کرسکیں۔''

علامہ کا اسلامی ریاست کا ماڈل ہر اعتبار سے مکمل تو نہیں لیکن ماضی، حال کے تمام نمونوں سے مختلف

ہے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو وجود میں کون لائے گا۔؟

جاوید خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ کاش وہ اِن نوجوانوں میں سے ہوتے جو اقبال کی اس ریاست کو عملی طور پر وجود میں لا سکنے کے قابل ہوتے۔ چونکہ ان کی نسل مایوس نسل ہے اور علامہ کی خواہش کے مطابق جاوید بھی نہ بن سکے۔ جاوید کی نسل نے تو مردِ حق کی رہنمائی میں پاکستان حاصل کر لیا۔لیکن پھر جو بھی حکمران میسر آئے پہلے قائم کردہ معیار پر پورے نہیں اترتے تھے لیکن ان کی نسل ابھی تک شجر سے پیوستہ ہے اور بہار کی امید رکھے ہوئے ہے۔

نئی نسل سوال کرتی ہے کہ اگر انہیں مردِ حق نہیں ملتا تو انہیں کیا کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں جاوید انہیں وہی پیغام دیتے ہیں جو کہ علامہ نے ''جاوید نامہ'' کے آخری حصہ ''خطاب بہ جاوید'' میں دے رکھا ہے یعنی غم اور دلگیری کو ایمان کی کمزوری اور غم کو نصف پیری کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حرص ہمیشہ کی محتاجی ہے اس لیے اپنے اوپر ضبط رکھو۔اس کتاب کا اختتام سورۃ الناس کی آیات کے ترجمے سے ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ :

''مَیں عوام کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں،
عوام کے حقیقی سربراہ کی
عوام کے اصلی معبود کی
اُس وسوسہ انداز کے شر سے
اُس خناس سے (جو خدا کا نام سن کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)
جو عوام کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے
خواہ وہ جنات سے ہو یا انسانوں میں سے (۱۵)''

دوسرا خط کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں۔

۱۔ جاوید اقبال علامہ اقبال کے حوالے سے کئی ایسے سوالات کے بارے میں جواب کے متلاشی ہیں جو اسلامی ریاست ،قومیت ،وطنیت ،توحید ،اجتہاد ،روحانی جمہوریت اور اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی

حیثیت اور قومی نظریہ وغیرہ کے بارے میں ہیں۔

علامہ اقبال کی وفات کے قریبا ساٹھ پینسٹھ سال بعد بھی یہ سوالات اہل علم و دانش کے ذہنوں میں سرسراتے ہیں اگر جاوید اقبال کے خط کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو وہ ان سوالات کے بارے میں الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنی سوانح عمری میں اس خط سے جو علامہ اقبال کے نام ان کی وفات کے بعد ہے ایک جذباتی تخیلاتی فضا پیدا کرنے کے علاوہ وہ کیا کام لینا چاہتے ہیں۔

۲۔ کیا ان سوالات کو سوانح عمری کا حصہ بنانا چاہئے تھا۔

۳۔ کیا افکار اقبال کے تسلسل میں وہ ان سوالات کا از خود جواب تلاش کر کے ایک جداگانہ کتاب ''افکار اقبال کے تسلسل'' میں موضوع نہیں بنا سکتے تھے۔

بدلتے ہوئے زمانے کی روشنی میں پاکستان کے اندر ان امور و مسائل کی حیثیت کیا ہے اس موضوع پر جاوید اقبال اپنی ذہنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ایک سلسلہ مضامین لکھتے اور فکر اقبال کو آگے بڑھاتے تو یہ اقبالیات کے باب میں ایک مثبت پیش رفت ہوتی لیکن جاوید اقبال نے ایسا نہیں کیا انہوں نے فکر اقبال کے حوالے سے اپنے خدشات کا ذکر سلسلہ ہائے سوالات کی صورت میں کیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''اے پدر محترم دین کی وہ کون سی تعبیر ہے جو ریاست کو معاشی ناانصافی اور ظلم سے محفوظ رکھتی ہے اور وہ کون سی تعبیر ہے جو شر اور فساد کا سبب بنتی ہے؟ نیز جو تعبیر شر اور فساد کا باعث بنتی ہے اس کے تدارک کے لئے کیا طریق کار اختیار کرنا چاہئے؟۔''(۱)

سوانح عمری کے حوالے سے بعد از وفات وہ بھی ساٹھ پینسٹھ سال بعد ایسا تخیلاتی خط سوائے اس کے کیا حیثیت رکھتا ہے کہ نسل نو اور علمائے حاضر کے سامنے بعض ایسے سوالات رکھے جائیں جو ایک سلسلہ بحث کو جنم دیں ذہنوں میں یہ سوالات سرگرداں رہیں ''کسی مناسب جواب کے لئے'' اور یوں فکر اقبال کا سفر آگے کی طرف گامزن رہے۔

☆☆☆

(ب)

''خودکلامی'' کا توضیحی جائزہ

ویسے تو سوانح عمری بھی ایک حوالے سے خودکلامی ہوتی ہے لیکن ''دوسرا خط'' کے بعد ''خودکلامی'' کے عنوان سے جاوید اقبال نے زندگی ذات، ایمانیات، عقائد مسلم ریاست پاکستان کا مسلم تشخص وغیرہ کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تمدن معاشرت دینی عقائد روایات وتعلیمات کے یہ خیالات جاوید اقبال کے مختصر تبصروں کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے کہ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں کہ جاوید اقبال نے اپنی روشن خیالی اور آزادروی کا ثبوت دیتے ہوئے ''اپنا گریباں چاک'' میں اقبال کے بعض مسلمہ نظریات پر تبصرے کئے ہیں اور تبصروں میں انہوں نے اپنی تنقیدی بصیرت کے اظہار کی بھی کوشش کی ہے۔ اپنے لب ولہجہ اور طرز استدلال سے وہ اپنی بے باکانہ رائے کے باوجود کہیں کہیں تشکیک کا شکار بھی دکھائی دیتے ہیں۔

معنی ومفہوم اور استدلال کی سطح اور گہرائی کا مظہر ''خودکلامی'' والا حصہ گزشتہ سے پیوستہ ہوتے ہوئے بھی کچھ مختلف اور سنجیدہ ہے اس کی حیثیت اک آخری بیان اور وصیت کی سی ہے شروع کے جملے دیکھئے :

> ''میری عمر اب اٹھتر برس ہے وقت تیزی سے گزر رہا ہے لیکن بسا اوقات مجھے احساس ہوتا ہے وقت کا کوئی وجود نہیں میں تیزی سے گزر رہا ہوں۔ یہیں سے میری مراد ''میری انا'' ہے جو میری زندگی میں حرکت کا باعث ہے یہ حرکت ہی میرا سفر حیات ہے جس کی پیمائش کے لئے وقت ایک آلے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔''(۱)

انٹرویو کے دوارن قائداعظم اور علامہ اقبال کی پاکستان سے محبت اور ان کی اقدار کے بارے میں کچھ اس

انداز میں اظہار کرتے ہیں کہ:

''۱۹۱۰ میں ہیلے جو دمدار ستارہ ہے اور اقبال نے کہا کہ میں اپنے پوتے کی آنکھ سے اسے دیکھوں گا ۱۹۸۵ء دیکھا گیا۔ یہ ہیلے کا مٹ ۷۵ سال کے بعد آتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں آیا۔ میرے بچوں نے اور میں نے بھی دیکھا۔ بچے کافی عمر کے تھے یعنی ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۴ء میں ان کی پیدائش ہے تو وہ دونوں بڑے بڑے ہی تھے۔

ہیلے کا مٹ کی دم اب ساری تباہ ہو چکی ہے۔ اس زمانے میں جب علامہ اقبال نے دیکھا تو پورے آسمان پر اس کی دم چھائی ہوئی تھی۔ تو اس کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ اب یہ اس طرح کا نہیں رہا، اب ٹوٹ گیا ہے کیونکہ انہوں نے ذکر کیا ہوا ہے تو میں نے اس سے یہ INFERENCE نکالا ہوا ہے کہ پاکستان بنانے سے پہلے جو ایک خط اس وقت قائداعظم کو انہوں نے لکھا ہوا ہے کہ اس میں بڑا اصرار کیا گیا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے مہربانی کر کے اب پاکستان کا ذکر کرو۔ یہی وجہ تھی کہ لاہور میں ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی منٹو پارک میں شریف المجاہد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جس وقت یہ قرارداد پاس کر لی گئی تو قائداعظم نے علامہ کے مزار کی طرف رخ کر کے کہا کہ:

Iqbal had been alive today. He would have been happy that we have done exactly what he wanted to do''.

یہ الفاظ انہوں نے کہے اور میں اس سے یہ تاثر لیتا ہوں کہ انہیں پاکستان بنتا دیکھنے کی اتنی زبردست خواہش تھی وہ تو اس سے پہلے ہی فوت ہو گئے آٹھ سال پہلے اتنی سخت خواہش تھی کہ وہ مرنا نہیں چاہتے تھے اور دیکھنا چاہتے تھے۔

اپنی آنکھ سے وہ اپنا تصوّر Realize ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا مرنے سے پہلے دو کتابیں لکھنے کا بھی ارادہ تھا ایک تو تھی ''قرآن جیسے کہ میں اسے سمجھتا ہوں'' دوسری تھی ''فقہ کی تدوین نو'' چونکہ وہ چاہتے تھے کہ اس سے ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ ''اجتہاد'' پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور نئی نئی تعبیریں آتی رہی ہیں اور اب بھی اس کی ضرورت ہے۔

دونوں کتابیں تو وہ نہ لکھ سکے زندگی نے وفا نہ کی لیکن یہ جو خواہش تھی جو پاکستان کے لئے لکھنا چاہتے تھے تو ان کی جو روح خواہ وہ برزخ میں کہیں بھی ہو تو مجھے اپنی جگہ پر یہ خیال ہے کہ وہ میری آنکھوں کو استعمال کر رہے ہیں کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے؟ چونکہ ان کی اپنی تسلی نہیں ہوتی چونکہ ان کی وفا بڑی بے چینی کے عالم میں ہے اور یہ اضطراب جو ہے۔ وہ میری زندگی کا جواز ہے۔

میرا اپنی زندگی کا کوئی جواز نہیں میں جو کچھ بننا تھا بن چکا ہوں جو کچھ کرنا تھا کر چکا ہوں اب میں زندہ رہنا بھی نہیں چاہتا ہوں ۸۴ سال کی میری عمر ہو چکی ہے لیکن Apparantly میری زندگی کا کوئی Purpose نہیں ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اتنی مدت سے کہ میں یہی Project کر رہا ہوں لیکن یہاں اس کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا قائداعظم کے نظریات اور اقبال کے نظریات ہم چھوڑ چکے ہیں ہم کسی اور ہی سمت روانہ ہو چکے ہیں یہ ملک اب اقبال اور جناح کا نہیں رہا we have to accept this چونکہ ہمارے اپنے سیاست دانوں میں شناسائی نہیں کہ قائداعظم کی قدریں کیا تھیں کس قسم کی ریاست چاہتے تھے قائداعظم پاکستان کو دیکھنا! کس قسم کی ریاست علامہ چاہتے تھے پاکستان کو دیکھنا۔''

جاوید اقبال کی یہ خود کلامی کئی ذاتی۔ علاقائی اور آفاقی Universal، Regionel، Personal

مسائل وامور کی نشاندہی کرتی ہے چند مقامات دیکھئے :

''۔۔۔یہ بھی ممکن ہے کہ میرا حیوانوں کی مخلوق سے کوئی تعلق نہ ہو میں نہ روح ہوں نہ بدن بلکہ خدا کے ان گنت افعال میں سے ایک ایسا فعل ہوں جس نے اربوں صدیوں میں مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے اتفاقا یا حادثاتی طور پر شعور حاصل کر لیا۔'' (۲)

''میرا شیطان میری بھوک اور شہوت ہیں'' (۳)

تصوف اور زندگی کے بعد موت کے بارے میں وہ کچھ اس انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ :

''مستقبل میں انسان، انسان کے مابین فاصلوں کو دور کرنا اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لانا شاید مذہب کے لئے ممکن نہ رہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ مذہب کی جگہ تصوف لے لے۔موت کے بعد زندگی کی توقع رکھنا میرا حق نہیں'' (۴)

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی اطاعت و رضا کے بارے میں جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ:

''والد کی طرف سے ورثہ میں مجھے جو سب سے قیمتی شے ملی ہے وہ یہی ہے کہ خدا کی رضا کے سامنے دم نہ مارو۔

میرا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے شیطان کو سزا اس لئے نہیں دی کہ اس نے کمزور انسانیت کے جداعلیٰ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تھا بلکہ محض اس لئے کہ اس نے حیات و کائنات کے عظیم خالق و مالک کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے احتراز کیا۔'' (۶)

کسی بھی قومی ریاست کے نظریے میں رواداری اور عملی صورتحال کے بارے میں جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں کہ :

''۔۔۔ہر قومی ریاست کسی نہ کسی نظریہ پر قائم ہے اور قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ اس کے اساسی نظریہ میں رواداری ہو اور نہ لچک ہو اور اس کی تعبیر اصولی بنا پر کرنے کی بجائے عملی طور پر کی جائے''۔۔(۷)

جاوید کسی بھی قوم کے حکمران کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ:

''ہر قوم کو ایسے ہی لیڈر ملتے ہیں جس کی وہ مستحق ہوتی ہے''۔۔۔(۸)

دراصل یہ خود کلامی جاوید اقبال کی وہ سوچیں ہیں جو ان کی زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ ہیں انہیں ان سوالات و مسائل کے لئے وقت نکالنا چاہئے تھا کہ وہ توجہ سے ان امور پر لکھتے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے عجلت میں اپنی فکری شخصیت کو دیکھا ہے ان کا جسم زندگی کے جن مراحل سے گزرا اس کا ذکر تو بارہ تیرا ابواب میں ہے مگر جہاں ان کی ذہنی تشکیل کا دروا ہوتا ہے وہاں انہوں نے ''دوسرا خط'' اور ''خود کلامی'' یعنی آٹھ دس صفحات میں سب کچھ سمیٹ دیا ہے۔

سوانح عمری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عظیم لوگوں نے جسمانی اور فکری دونوں حوالوں سے اپنی زندگی کے احوال لکھے ہیں فزیکل اور مینٹل Physical and Mental دونوں کی تشکیلات سے زندگی مکمل ہوتی ہے لیکن اپنا ''گریباں چاک'' اس حوالے سے توجہ طلب سوانح عمری ہے کہ اس میں جاوید اقبال (مصنف) کی ذہنی تشکیل کا احوال بہت مختصر اور وہ بھی سوالات کی صورت میں ہوا ہے۔

جاوید اقبال بہت کچھ لکھنا اور بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔انہوں نے ''دوسرا خط'' کی طرح ''خود کلامی'' میں تخلیق کائنات خیر و شر، ابلیس، اسلامی تشخص، نظریاتی ریاستیں، پاکستان اور کئی دوسرے اہم مضامین کے بارے میں مختصر لکھا ہے اس خود کلامی میں وسوسے بھی ہیں، تشکیک بھی، متعین بھی بہت کچھ دیکھ کر اور بہت کچھ دیکھنے کی آرزو بھی بہت کچھ کہہ کے اور بہت کچھ کہنے کی حسرت بھی ایک عجلت ہے جس میں یہ تحریر سمٹتی ہے اور آخر کار سورۃ الناس پر ختم ہو جاتی ہے۔اس کا تجزیہ نفسیات دان بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ان اختتامی سطور میں ایک انجام بخیر کی خواہش ملتی ہے جو اپنی جگہ ایک نیک فال ہے۔

جاوید اقبال جو کچھ بھی ہیں جیسے بھی ہیں انہوں نے جو کچھ کہا اور جو کچھ وہ کہہ نہ سکے اپنے احوال حیات کا اختتام وہ قرآن مجید کی اس مبارک سورۃ الناس پر کر رہے ہیں۔

اس دعا پر۔

میں عوام کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں
عوام کے حقیقی سربراہ کی ۸
عوام کے اصلی معبود کی
اس وسوسہ انداز کے شر سے
اس خناس سے (جو خدا کا نام سن کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)
جو عوام کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے
خواہ وہ جنات سے ہو یا انسانوں میں سے

(سورۃ الناس)

یہاں انہوں نے ناس کا ترجمہ انسانوں (انسان) کے بجائے عوام سے کیا ہے عوام ایک سیاسی اصطلاح بھی ہے اور موجودہ زمانے میں ایک خاص رنگ مفہوم سے عبارت ہے جب کہ انسان کا لفظ وسیع مطالب اپنے اندر رکھتا ہے۔ بہر حال ''اپنا گریباں چاک'' کا انجام ایک مبارک دعا پر ہوتا ہے یہ دعا اور یہ انجام جاوید اقبال کی رگوں اور لاشعور میں چھپے ہوئے اس ذخیرہ ایمانیت کی علامت ہے جو اسے ورثہ میں ملا ہے اور جس کے پیچھے یقیناً علامہ اقبال کی دعائیں بھی ہیں جو انہوں نے بچپن میں جاوید اقبال کے لئے مانگی ہیں۔

حوالہ جات

الف:

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۸۰

ب:

۱۔ ایضاً، ص ۲۸۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۸۵

۳۔ ایضاً، ص ۲۸۶

۴۔ ایضاً، ص ۲۸۷

۵۔ ایضاً، ص ۲۸۷

۶۔ ایضاً، ص ۲۸۷

۷۔ ایضاً، ص ۲۸۷

۸۔ ایضاً، ص ۲۸۸

☆☆☆

باب ششم

اقبال اور جاوید اقبال، محسوس اور غیر محسوس ذہنی کشمکش کا مطالعہ و تجزیہ

''اپنا گریباں چاک'' میں علامہ کی جاوید سے محبت کے نمونے جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ ابتداء ہی میں جاوید اقبال کی جنم پتری بنوانے کا ذکر اسی محبت کی ایک مثال ہے۔ اقبال اپنے چھوٹے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں بہت متفکر تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ستارہ شناسی کے سہارے سے ان کے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کی آفتاب اقبال، جاوید اقبال سے چھبیس برس بڑے تھے۔ اقبال کی زندگی میں ان کے ساتھ اچھے تعلقات استوار نہ ہو سکے۔ پھر جاوید اقبال کا نام اپنے مرضی سے تجویز کرنا علامہ کی محبت کا مظہر ہے کیونکہ علامہ کے والد نے قمر الاسلام تجویز کیا، لیکن علامہ کو یہ نام پسند نہ آیا اور انہوں نے اپنے بیٹے کا نام جاوید رکھ دیا۔

مختلف تہواروں میں بھی اقبال اور جاوید اقبال کی محبت کے نمونے جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ عید ان کے ہاں بھرپور طریقے سے منائی جاتی تھی۔ عید کے چاند کے بارے میں جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''میں عموماً والد کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ گو مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی لیکن اس شب گرم پانی سے والدہ نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے نہاتا نئے کپڑے یا جوتوں کا جوڑا سرہانے رکھ کر سوتا صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے عیدی ملتی۔ کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے مجھے والدہ پہنایا کرتیں۔ سر پر تلے کی گول ٹوپی پہنتا اور کلائی پر باندھنے کے لئے مجھے ایک سونے کی گھڑی بھی دی جاتی جو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے مجھے تحفے کے طور پر بھیجی تھی۔''(۱)

بسنت کا دن منانے کے لئے بھی جاوید اقبال کی فرمائش پر خوب اہتمام کیا جاتا۔ سارا

دن پتنگیں اڑانے اور پیچ لڑانے میں گزرتا علامہ خود بھی جاوید کے ساتھ مل کر پتنگ اڑایا کرتے۔ اقبال جاوید کو ''بابا'' اور منیرہ کو ''بی'' بلایا کرتے تھے۔ وہ منیرہ کو بہت پیار کرتے تھے۔

جاوید اقبال کا سکول میں داخلہ اور پہلے دن سکول جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے والدین کی محبت کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ۔

''مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہے جب میں پہلی بار سکول گیا۔ مجھے سیکرڈ ہارٹ مشنری سکول میں داخل کیا گیا۔ جہاں لڑکیوں کے ساتھ پڑھائی ہوتی تھی۔ میری عمر کوئی پانچ ساڑھے پانچ برس کی ہوگی والدہ بہت فکر مند تھیں کہ میں سارا دن گھر سے دور کیسے رہ سکوں گا۔ والد انہیں دلاسہ دیتے رہے لیکن ساتھ خود بھی علی بخش سے پوچھتے کہ جاوید کو لینے کب جاؤ گے؟ چھٹی ہونے پر جب میں گھر آیا تو والدہ برآمدہ میں کھڑی میری راہ تک رہی تھیں والد بھی اپنے کمرے سے اٹھ کر آ گئے اور پوچھنے لگے کہ کہیں اداس تو نہیں ہو گئے تھے۔''(۲)

اکثر مقامات پر جاوید اقبال نے یہ شکوہ کیا ہے کہ ان کے والدان سے ویسی محبت نہیں کرتے تھے۔ جو عام آدمیوں کو اپنے اولاد سے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں۔ کہ ان کے والد محترم انہیں کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ بچپن میں کھیلتے ہوئے جاوید نے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گر پڑے جس کے سبب ہونٹ کٹ گیا اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اتفاق سے اسی لمحے اقبال زنان خانے میں داخل ہوئے اور جاوید کا خون دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ یہ محبت نہیں ہے تو کیا ہے؟

اسی محبت کا ذکر ایک اور جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

''میں اگر کبھی بیمار ہو جاتا تو بڑے پریشان ہوتے ایک مرتبہ میرے گلے میں ایک گلٹی سی بن گئی آپ اتنے فکر مند ہوئے کہ بخار چڑھ گیا لیکن اس کے باوجود مجھے خود ساتھ

لے کر ڈاکٹر یعقوب بیگ کے کلینک گئے اس نے سرجری کر کے گلٹی نکال دی اور میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا مگر مدت تک آپ کا بخار نہ ٹوٹا۔'' (۳)

جاوید اقبال کی مصوری سے دلچسپی کو دیکھتے ہوئے علامہ اقبال نے آرٹ کے اعلیٰ نمونے باہر سے منگوا کر دیئے تا کہ وہ اپنے شوق کی آبیاری کر سکیں۔ یہ ایک باپ کی غیر معمولی محبت نہیں تو اور کیا ہے۔؟ باپ کی عدم محبت کا گلہ ایک ناسمجھ بچہ کرتا تو یہ بات قابل قبول تھی لیکن یہاں ایک ایسا باشعور انسان اس کا بلا جواز ذکر کر بیٹھا جو رشتوں کی پہچان اور باپ بیٹے کے مضبوط تعلق سے اپنی عملی زندگی میں بخوبی متعارف ہو چکا ہے۔ ایک مقام پر جاوید اقبال نے اقبال کی خاموش محبت کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے بعض اوقات اپنائیت بھری یہ خاموشی ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتی تھی۔ یہ مختلف بیانات دراصل جاوید اقبال کی اس ذہنی کیفیت کو واضح کرتے ہیں جو ''انا'' اور ''محبت'' کی آویزش کی عطا ہے۔

جاوید کی والدہ کی وفات کے بعد بچوں کی دیکھ بھال کے لئے اقبال بہت پریشان تھے۔ سفر پر جاتے ہوئے اقبال جاوید کو ساتھ لے جاتے کہ کہیں وہ ان کی غیر موجودگی میں منیرہ سے لڑتے نہ رہیں۔ اپنی بیوی کی وفات کے بعد علامہ صرف ایک بار زنان خانے میں آئے تھے۔ وہ بھی اس وقت جب جاوید شدید زکام کی وجہ سے بستر پر تھے۔ یہ ان کی محبت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اقبال نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا لیکن جاوید کے اصرار پر انہوں نے از سر نو خضاب لگانے کو کہا تو انہوں نے خضاب لگانا شروع کر دیا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی پھر چھوڑ دیا اور پھر کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ انہیں دوبارہ اس کے لئے مجبور کر سکیں۔

علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سخت مزاج اور قدامت پسند ذہنیت رکھتے تھے انہیں بچوں کی تربیت کے لئے کسی یورپی خاتون کا تقرر بالکل پسند نہیں تھا لیکن علامہ کا بہت کوششوں کے بعد جرمن کی خاتون ڈورس کا بچوں کی تربیت کے لئے رکھنا جاوید سے محبت کا اظہار ہی تو ہے۔

جاوید کا امتحان کے دنوں میں الف لیلیٰ پڑھنے کا واقعہ اور فیل ہونا اور اقبال کا بجائے اس کے کہ ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور یہ کہنا کہ:

''اگر تم امتحان میں کامیاب ہوجانے کے بعد الف لیلیٰ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا''۔(۴)

اقبال کی زندگی میں جاوید اقبال کو اپنے باپ کی شفقت اور محبت کا اندازہ نہ ہوسکا اور وہ اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں علامہ عام انسانوں کی طرح اپنے بیٹے کو پیار سے بھینچتے یا انہیں گلے سے نہیں لگاتے تھے۔ اقبال بظاہر کم گو سرد مہر دکھائی دیتے تھے۔ جاوید اکثر اوقات انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کیے اپنے خیالات میں مستغرق پاتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہیں اپنے بیٹے سے محبت نہیں تھی ان کی محبت کے اظہار میں ایک انفرادی خاموشی تھی جسے سمجھنا جاوید کے لئے مشکل تھا:

''اپنی زندگی میں والد نے مجھے شاذ ہی کوئی ایسا موقع دیا گیا ہوگا جس سے میں ان کی شفقت یا الفت کا اندازہ کرسکتا جو انہیں میری ذات سے تھی۔ باپ بیٹوں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں انہیں گلے لگاتے ہیں، انہیں چومتے ہیں، لیکن مجھے ان کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے مجھے کبھی گھر میں منہ اٹھائے ادھر ادھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیانہ انداز میں، گویا کوئی انہیں مجبوراً مسکرانے کو کہہ رہا ہو اور اکثر اوقات تو میں انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کئے اپنے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہیں مجھ سے محبت نہ تھی سراسر غلط ہے ان کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کی خاموشی تھی۔ جس میں غیر ضروری ہیجان کا فقدان تھا یا اس کی نوعیت فکری یا تخیلی تھی جسے سمجھ سکنا میرے لئے مشکل تھا بہرحال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان سے محبت تھوڑی کرتا تھا اور خوف زیادہ کھاتا تھا۔''(۵)

جاوید اقبال کا یہ شکوہ کہ میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا ہمیشہ ایک چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا باعث حیرت ہے۔ اقبال تو وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں ہی اولاد کی آسائشوں کی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنایا۔ ''جاوید منزل'' بیٹے کے نام کر کے اس میں بطور کرایہ دار رہنا، آسٹریا میں علاج کی غرض

سے محض اس لئے نہ جانا کہ وہ روپیہ خرچ ہوگا جس پر مستقبل میں ان کی اولاد کا حق ہے۔ یہ سب فیصلے ایک باپ کے محبت بھرے دل کی بدولت ہی وجود میں آئے۔

''جاوید منزل'' جاوید اقبال کے نام منتقل کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''گھر کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد ہم میورو ڈ پر اٹھ آئے مگر والدہ نئے گھر میں بیمار گاڑی میں ہی لائی گئیں کیونکہ ان دنوں وہ سخت علالت میں تھیں انہیں چارپائی پر لیٹے اندر لایا گیا۔ دوسرے روز جب والد انہیں دیکھنے کے لئے زنان خانے میں آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذات اٹھا رکھے تھے۔ والدہ سے کہنے لگے کہ اس مکان کو جاوید کے نام ہبہ کر دو لیکن والدہ نہ مانتی تھیں وہ کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم یہ لڑکا بڑا ہو کر کیسا نکلے۔ میں جلد صحت یاب ہو جاؤں گی آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ مگر والد نے انہیں آگاہ کیا کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے اس پر انہوں نے بغیر کچھ کہے ہبہ نامہ پر دستخط کر دیئے۔ یوں جاوید منزل میرے نام منتقل ہوگئی۔ والد نے ایک کرایہ نامہ بھی تحریر کیا جس کی رو سے آپ میرے کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگے۔ آپ سامنے کے تین کمروں میں رہائش کا پیشگی کرایہ ہر ماہ کی اکیس تاریخ کو ادا کرتے تھے۔''(۶)

اس آپ بیتی میں یہ محبتیں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ اور جاوید ان سے پیچھا چھڑانا بھی چاہیں تو نہیں چھڑا سکتے۔ جاوید کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ان محبتوں کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ محبت تو بلاشبہ ان کو اپنے والد سے اور والد کو جاوید سے ہے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ لوگ ان کو صرف فرزند اقبال کے حوالے سے نہ پہچانیں بلکہ ان کی کوئی الگ پہچان بھی ہو جو جاوید اقبال کے اپنے حوالے سے ہو۔ لیکن اقبال کے ساتھیوں اور تمام دنیا نے ان کو بڑا نہیں ہونے دیا۔ اور پسر اقبال کے حوالے سے ہی جانا۔ اس لئے اکثر مقامات پر یہ محبت گریز یا کشمکش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' میں ایک نہیں متعدد مقامات پر جاوید اقبال نے اپنی شخصیت پر علامہ اقبال کے

اثرات سے صاف انکار کیا ہے اور بعض اوقات فرزندِ اقبال ہونا ان کے لیے باعثِ تکلیف اور جھنجھلاہٹ کا باعث بھی ثابت ہُوا ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''۔۔۔ مجھے علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے یا ان کا فرزند ہونے پر غصہ نہیں، البتہ علامہ اقبال کے ان پرستاروں پر غصہ ضرور آتا ہے جو ان کے افکار کی نفی کرتے ہوئے مجھے صرف ''فرزند اقبال'' کی حیثیت سے جاننا چاہتے ہیں اور اس ''فریم'' سے میرا باہر نکلنا انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ میں جب کبھی ملک سے باہر لیکچروں کے لئے بلوایا جاتا ہوں تو میری شناخت ''جاوید اقبال'' کے طور پر ہوتی ہے مگر میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک کے اندر میری حیثیت ''فرزند اقبال'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جب ۱۹۷۷ء میں وفاقی حکومت نے ہمارے گھر ''جاوید منزل'' کو ''اقبال میوزیم'' بنانے کی خاطر خرید لیا تو میرے دو معصوم بچوں نے مجھ سے سوال کیا کہ ابّو اَب ہمارا کیا بنے گا؟ مَیں نے انہیں کہا کہ تم دونوں کو علیحدہ علیحدہ بوتلوں میں بند کر کے یہاں سجا دیا جائے گا۔ کہنے لگے ''اور آپ کہاں جائیں گے؟'' میں نے جواب دیا ''بیٹا مَیں تو پہلے ہی بوتل میں بند ہوں۔'' (۷)

یہ اور ایسے دیگر مقامات جہاں جاوید اقبال نے علامہ اقبال سے اپنے رشتے کو باعثِ تکلیف اور ان کے مقام کو اپنی پہچان کے لیے باعث، آزار قرار دیا ہے ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔

جاوید اقبال کی اکثر تحریروں میں ناگواری اور باپ کے فیصلوں سے متعلق بیزاری کے اثرات نمایاں ہیں مثلاً ایک سفر میں جب اقبال نے سروجنی نائیڈو کو اپنی ساتھ والی سیٹ میں بٹھالیا اور جاوید کو علی بخش کے ہمراہ ڈگی میں بیٹھنا پڑا تو انہیں بہت ناگوار گزرا اور اپنی اس ناگواری کا اظہار انہوں نے واضح انداز میں کیا ہے۔

شعرا اور مفکرین کے حوالے سے جاوید اقبال کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ بے عمل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ درج ذیل اقتباس میں ان کے لہجے میں طنز کی زیریں لہر موجود ہے:

''عجیب بات ہے کہ مفکر اور شاعر ہونے کے باوجود والد ایک عملی انسان تھے۔ وکالت کے پیشہ سے تعلق بھی ان کی شخصیت کے اس پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے تو ایک بند خط میری والدہ کے نام لکھ کر میاں امیر الدین کے پاس چھوڑ گئے۔ خط میں لکھا تھا کہ اگر ان کے ساتھ کوئی نیکی بدی ہو جائے تو اکاؤنٹ کس بنک میں ہے۔ تصانیف کی رائلٹی کا حساب کیا ہے نیز اس صورت میں والدہ کو کیا کرنا ہوگا۔ لفافہ پر درج تھا کہ میری موت پر کھولا جائے۔''(۸)

جاوید اقبال اپنی بے راہ روی کا ذکر بلا جھجک کرتے ہیں۔ اقبال کی وفات کے بعد جاوید کی زندگی مکمل آزاد ہوگئی۔ وہ ہر قسم کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہو گئے۔ جن باتوں سے اقبال نے انہیں منع کیا تھا وہ انہوں نے بڑی کثرت اور بڑے شوق کے ساتھ اپنالیں۔ نیکی اور بدی میں سے بدی کا راستہ منتخب کیا۔ اقبال کی زندگی میں سرِ شام گھر موجود رہنے کا حکم تھا ان کی وفات کے بعد جاوید آدھی آدھی رات تک گھر نہ آتے۔ پہلے سینما دیکھنا منع تھا 'اب روز دو دو تین تین شو دیکھے جاتے۔ روزمرہ کے باورچی خانہ کے حساب کے پیسوں میں گھپلے کرتے۔ رنگ برنگی ریشمی قمیضیں' ولایتی بوٹ اور یورپی لباس پہنتے۔ اگر کبھی اچکن پہننی پڑ جاتی تو وہ بھی بہترین درزی کی سلی ہوتی۔ مشہور دکانوں سے شاپنگ کی جاتی۔ بڑے اور معروف ریستورانوں میں وقت گزارا جاتا۔ مے نوشی' یورپی طرز کے رقص و سرود سے دل بہلایا جاتا۔

جاوید کو فرزندِ اقبال ہونے پر غصہ نہیں بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ انہیں ''فرزند اقبال'' کی بجائے ''جاوید اقبال'' کی حیثیت سے پہچانا جائے۔ تاہم قومی تقریبات میں مزار اقبال پر وہ جانا اس لیے پسند نہیں کرتے کہ وہ سجادہ نشینی کو پسند نہیں کرتے۔ علامہ ایک جدید مسلم شاعر اور مفکر تھے جو پیری مریدی کی روایت کو مسلمانوں کے تمدنی زوال کا سبب گردانتے ہوئے اس سے متنفر تھے۔ اس لیے جاوید بھی اس چیز کو پسند نہیں کرتے اور جہاں تک آگے نکلنے والی بات ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ علامہ کسی صاحبِ فکر سے آگے بڑھ جانے سے مراد اس کی

تحقیر کرنا نہیں بلکہ اس کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے اور اس کے بتائے ہوئے رستہ سے نئی راہیں تلاش کرنا دراصل فکری تسلسل کو آگے بڑھانا ہے۔ جہاں تک جاوید کی ذات کا تعلق ہے انہوں نے اپنی ذاتی کاوش کے ذریعے افکار اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی اور گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں مختلف قسم کی تقریبات میں مختلف مقالات پیش کیے جو کہ ایک طرح کا اقبالی تبصرہ تھا لیکن چونکہ وہ انہیں اپنے سیاسی اور ثقافتی ماحول کے ردعمل کے طور پر تحریر کرتے تھے اس لیے وہ ان کے فکری کرب کی عکاسی کیا کرتے تھے۔

''اپنا گریباں چاک'' کے حوالے سے انور محمود خالد رقم طراز ہیں کہ:

''۔۔۔فرزندِ اقبال۔۔۔جاوید اقبال کا نفسیاتی المیہ یہ ہے کہ انہوں نے قدم قدم پر اپنا موازنہ اپنے والدِ گرامی سے کیا ہے اور ہر جگہ خود کو ان کے مقابلے میں چھوٹا محسوس کیا ہے حالانکہ جس طرح کسی باپ کے لیے یہ حقیقت باعثِ شرم نہیں ہوتی کہ اس کا بیٹا زندگی کی دوڑ میں اس سے آگے نکل گیا ہے' اسی طرح کسی بیٹے کو بھی یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ اس کا باپ علمی و ادبی دنیا میں اتنا بلند مقام ہے کہ وہ چاہے بھی تو ان بلندیوں کو نہیں چھو سکتا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے دنیاوی اعتبار سے وہ سب کچھ بڑی آسانی سے حاصل کیا جو ان کے نامور والد نے قدرے طویل جدوجہد کے نتیجہ میں اور نامساعد حالات کے باوجود حاصل کیا اور وہ کچھ بھی' جو ان کے فقیر منش والدِ گرامی خواہش و حسرت کے باوجود حاصل نہیں کر سکے۔ باپ ہی کی طرح جاوید اقبال نے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ بار ایٹ لا کیا۔ پی ایچ ڈی کی۔ پروفیسر بنے۔ وکیل بنے۔ کتابیں لکھیں۔ مقالے لکھے۔ سیاست میں حصہ لیا۔۔۔قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور اپنے علمی خطبات کے ذریعے اپنی قابلیت کا سکّہ بٹھایا۔ شہرت کمائی' عزت کمائی' دولت کمائی اور رزق حلال کے ذریعے قابلِ اطمینان' آبرومندانہ' آسودہ زندگی

گزاری۔ بلکہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دنیاوی ترقی میں باپ سے کئی قدم آگے بھی بڑھائے کیونکہ علامہ اقبال نہ جج بن سکے تھے اور نہ چیف جسٹس لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز ہوئے اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے واجب الاحترام جج بھی بنے۔۔۔سرخاب کے یہ دو پر واقعی بیٹے کی ٹوپی میں زائد ہیں جب کہ باپ کا طرہ دستاران سے محروم رہا۔ جاوید اقبال چاہیں تو اس امتیاز پر فخر کر سکتے ہی کیونکہ (صرف یہاں) ان کا سایہ باپ کے سائے سے آگے نکلتا ہُوا نظر آتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کیا یہ موازنہ پدر و پسر درست ہے؟۔۔۔غالباً نہیں۔۔۔کیونکہ علامہ اقبال اس لیے علامہ اقبال نہیں بنے کہ وہ ایم اے، پی ایچ ڈی اور بار ایٹ لا تھے یا اس وجہ سے کہ وہ ایک قابل وکیل تھے یا اس وجہ سے کہ وہ ملکی سیاست میں حصہ لے کے مصور پاکستان بنے۔ علامہ اقبال کو امت مسلمہ نے اس شہرہ آفاق شاعری کی وجہ سے سر آنکھوں پر بٹھایا جو حیات و کائنات کے اسرار کی نقاب کشائی کرتی ہے اور جس نے ایک نازک موڑ پر ہندی مسلمانوں کی کشتی کو بے یقینی کے گرداب سے نکال کر ساحلِ مراد سے ہمکنار کیا۔'' (۹)

جاوید اقبال کے لئے ایک طرف باپ کے حوالے سے پہچان تکلیف کا سبب ہے تو دوسری جانب ایسے لوگوں کی لاعلمی غصے کا باعث بنتی ہے جو انہیں پہچانتی ہی نہیں۔ جو بانیان پاکستان کو فراموش کر چکے ہیں تین صفحات کے اس پیش لفظ میں واضح فطری تضاد ملتا ہے۔ پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں منایا کیونکہ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ جوان ہوا تو تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا یہ میرے لئے پدرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔ زندگی میں اچھا برا اپنا مقام

پیدا کیا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔تو مجھے بہت برا لگا یہ میری ''انا'' کی نشوونما میں مداخلت تھی۔اب بوڑھا ہو چکا ہوں،تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے عجیب اتفاق ہے۔میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا یعنی تن آور درخت کے سائے تلے ایک ننھا سا پودا پروان چڑھتا ہے۔وہ دراز قد ہو جائے اپنی صورت نکال لے تب بھی پودا ہی رہتا ہے اور بڑے درخت کے حوالے سے ہی پہچانا جاتا ہے۔''(۱۰)

جاوید اقبال کے لاشعور میں یہ بات ہمیشہ سے موجود رہی ہے کہ ایک نامور باپ کی اولاد کی حیثیت سے ان کی ذات میں ایک ہیرو کی صفات موجود ہیں اور وہ غیر معمولی عہدے اور منصب کے حق دار ہیں۔ وہ کسی ایک عام خاندان کے فرد ہوتے تو خود شناسی کا یہ عمل خاصی حد تک مختلف ہوتا۔ان کا یہ موقف کہ انسان ''شر'' سے ماورا نہیں ہوسکتا۔''شر'' کے چنگل میں پھنس کر ہی اچھائی اور خیر کی حقیقت کو سمجھا جاسکتا ہے۔علامہ کی وفات کے بعد انہوں نے ہر اس عمل کو اپنایا جس سے اقبال نے اپنی زندگی میں انہیں منع فرمایا تھا۔جاوید کو اپنے اس طرز عمل پر کوئی ندامت بھی نہیں ہے۔قیوم نظامی نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن کے تحت ''اپنا گریباں چاک'' پر ایک تقریب منعقد ہوئی اس میں یہ کہتے ہیں کہ:

''جاوید قبال کو گلہ ہے کہ وہ اپنے والد کے سایے سے باہر نہ نکل سکے اور اقبال کے نام سے ہی پہچانے گئے انہوں نے خود ہی تحریر کیا ہے کہ وہ ساتویں نہم ایم اے انگریزی اور قانون میں پہلی بار فیل ہوتے رہے جس سے ان کی اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے انہیں خدا اور اپنے عظیم والد کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ خوشحال اور شہرت سے بھرپور زندگی گزارنے میں کامیاب رہے اگر وہ فرزند اقبال نہ ہوتے تو گم نام زندگی ان کا مقدر ہوتی۔''(۱۱)

جاوید کو عظیم باپ کی وجہ سے بچپن اور جوانی میں وہ تمام آسائشیں اور سہولیات حاصل تھیں جن کی توقعات معاشی یا معاشرتی حوالے سے کسی کمزور انسان کی اولاد کو ہرگز نہیں ہوسکتیں اقبال کی وفات کے بعد ان کے فرزند کی

حیثیت سے معاشی حوالے کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سماجی طور پر جو عزت اور تکریم انہیں حاصل ہوئی جاوید اقبال اس سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں جاوید کچھ بھی کہیں مگر ان کی کامیابی کے پیچھے اقبال کی شخصیت ہی کارفرما ہے۔

مشفق خواجہ اس بارے میں اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''جاوید اقبال کی شناخت ملک میں اور بیرون ملک یکساں ہے۔ یعنی وہ فرزند اقبال ہی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور انہیں زندگی میں جو کچھ ملا وہ مالی آسودگی ہو یا عہدے، وہ اعزازی ڈگریاں ہوں یا غیر ملکی اسفار کے پے در پے موقع، یہ ان کی ذاتی کوشش کا نہیں، فرزند اقبال ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، لیکن یہ ڈگریاں ہزاروں نہیں، لاکھوں افراد حاصل کرتے ہیں لیکن ان کو وہ مرتبہ وہ حیثیت اور مقام نہیں ملتا جو جاوید اقبال کو ملا۔ جاوید اقبال نے علم وادب کی دنیا میں یا کسی دوسرے فن کے حوالے سے کوئی ایسا کارنامہ بھی انجام نہیں دیا جو بے مثال ہو تو پھر اپنی الگ پہچان اور الگ شناخت پر اصرار کیوں؟ (۱۲)''

ایک اور جگہ اسی خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنی شناخت بنانے کی کوشش نہیں کی، اس نیک کام کے انجام دینے کا موقع انہیں زیر نظر کتاب میں ملا تھا لیکن اس کتاب پر بھی جاوید اقبال سے زیادہ علامہ اقبال چھائے ہوئے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس کتاب کا نام بھی ان کے ایک شعر سے اخذ کیا گیا ہے اور کتاب میں جا بجا انہیں کے اشعار سے فضا ہموار کی گئی ہے۔ اگر اس کتاب میں علامہ اقبال کو حذف کر دیا جائے تو باقی جو کچھ بچے گا وہ جاوید اقبال کی نامکمل داستان حیات ہوگی۔ ''اپنا گریباں چاک'' پر اقبال کا سایہ اس حد تک ہے کہ مجھے اندیشہ ہے، آگے چل کر یہ کتاب یونی ورسٹیوں کے اقبالیات کے نصاب میں شامل ہو جائے گی بعض چیزیں اپنی ضد کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں، اس اصول کے تحت اقبال کو

بھی اس کتاب کے ذریعے پہچاننے میں مدد ملے گی۔(۱۴)''

مشفق خواجہ جاوید اقبال کی علامہ سے گریز اور کشمکش کے بارے میں اسی خط میں ایک اور جگہ بڑی خوبصورت وضاحت بیان کرتے ہیں کہ:

''یہ کتاب علامہ اقبال کے آخری دور کی ایک ایسی عینی شہادت ہے جو فرزند اقبال نے بظاہر اپنے بیان دفاع میں پیش کی ہے اور اس بڑ کے درخت کے حوالے سے جس کا نام علامہ اقبال ہے نکلنے کی سعی کی ہے تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں بھی اقبال علامہ اقبال ہی نظر آتے ہیں اور ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی نظری حیثیت میں اپنی ذات کو جتنا بھی بلند کرنے کی سعی کریں وہ فرزند اقبال ہی دکھائی دیتے ہیں۔''(۱۵)

''اپنا گریباں چاک'' کے مطالعے کے دوران میں قاری کے ذہن میں ایک سوال بار بار سر اٹھاتا ہے کہ جاوید اقبال نے علامہ اقبال کی حیات وافکار سے کیا اثرات قبول کئے۔ یہ بات پوری کتاب میں بین السطور جھلکتی ہے اور علامہ کے حوالے سے محبت اور گریز کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا ہیں علامہ اقبال ان کی پہچان اور شناخت کا بہت بڑا حوالہ تھے۔۔۔ ہیں۔۔۔اور ہمیشہ رہیں گے اگرچہ انہوں نے دیباچہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی ذات میں بھی کچھ ہیں اور علامہ اقبال کے حوالے سے ہٹ کر بھی اپنی ایک جداگانہ شناخت رکھتے ہیں جس کے پیچھے ان کی اپنی کارکردگی، محنت اور ریاضت کا بھی عمل دخل ہے یہ بات کہنے کی حد تک تو جاوید اقبال کے موقف کی وضاحت کرتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں علامہ اقبال کی شہرہ آفاق شخصیت جو اردو و فارسی زبان وادب پاکستان، مسلمانان پاک و ہند بلکہ پوری امت مسلمہ کے ایک فخر کا حوالہ ہیں ان کے اپنے خاندان اور اولاد کے لئے نیک نامی شہرت اور شناخت کا حوالہ کیوں نہ ہوگی۔؟

اس کے پس منظر میں چھپی حقیقت کو نظر انداز کرنے کی جاوید جتنی مرضی کوشش کریں ان کا خاندانی پس منظر خود بولتا ہے۔ان کے ہر عہد حیات میں ان کی سوشل حیثیت (Social Status) میں علامہ اقبال کی ذات ایک روشن چراغ کی طرح رہی ہے۔اس پس منظر سے کٹ کر اور اس شناخت سے ہٹ کر ان کی ذات وہ

کبھی نہ ہوتی جو آج ہے۔

جب جاوید اقبال سے انٹرویو کیا گیا۔ اور ان سے یہ سوال کیا گیا کہ گریز اور کشمکش کے حوالے سے اب تک کوئی تبدیلی نظر آتی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ:

''سمجھوتہ تو ہو گیا تھا۔ یہ ایک زندگی کا دور تھا جس میں میری اپنی طرف یہ کوشش تھی کہ بڑے درخت کے سائے سے نکلوں اور الگ پہچان کراؤں بھی یہ انہی کا دیا ہوا سبق ہے کہ ''اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر اپنی خودی کو پہچاننے کی کوشش کرو'' یہ انہی کا پیغام تھا جس کی وجہ سے میں ان کے آخر سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سوال ____: گویا پہلے آپ ''اسرار خودی'' کی منزل میں تھے اب ''رموز بے خودی'' میں داخل ہو گئے ہیں؟

جواب ____: ہاں سمجھوتہ اس بنا پر ہو گیا تھا۔ Because of age۔ عمر میری اتنی گزر چکی ہے لیکن پھر بھی مجھے اقبال کا چھوٹا سا بیٹا سمجھا جاتا ہے یعنی فرزندِ اقبال اب تو سمجھوتہ اس لئے کر لیا اب میں کیا کروں۔ اب میری عمر اپنی اتنی ہو گئی ہے۔ اب کوئی سمجھتا ہے تو سمجھ لے۔

میرے بچوں نے جب جاوید منزل چھوڑنے لگے تھے تو انہوں نے پوچھا تھا۔ کہ اب ہم کیا کریں گے؟ آپ کیا کریں گے؟ ہمارا کیا بنے گا۔؟ میں نے کہا کہ تم کو بوتل میں بند کر کے یہاں رکھیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ اب آپ کیا کریں گے؟ تو میں نے کہا کہ ''میں تو پہلے ہی بوتل میں بند ہوں''۔

بعض میرے اپنے احباب ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی تمہیں ملا ہے یا جو کچھ تم حاصل ہے۔ وہ باپ کے نام کی وجہ سے کر رہے ہو لیکن میرا یہ اپنا خیال ہے کہ نہیں میں جتنا باہر جاتا رہا ہوں مجھے جو اتفاق ہوا باہر جانے کا وہ علامہ کی وجہ سے نہیں وہ میری وجہ

سے مجھے بلاتے تھے۔بعض لوگ جانتے نہیں ہی تھے کہ علامہ اقبال کون ہیں۔؟''

انٹرویو میں جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ اقبال سے آپ نے جتنا بھاگنا تھا وہ آپ بھاگ لئے؟ تو انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں جواب دے کر اس گریز اور کشمکش کا خاتمہ کر دیا۔

:''ہاں میں پھر انہیں کی طرف لوٹ آیا ہوں۔''

حوالہ جات

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۰۴ء) ص ۸

۲۔ ایضاً، ص ۲۰، ۲۱

۳۔ ایضاً، ص ۳۳

۴۔ ایضاً، ص ۳۷، ۳۸

۵۔ ایضاً، ص ۲۸

۶۔ ایضاً، ص ۲۷

۷۔ ایضاً، ص ۲۶۶

۸۔ ایضاً، ص ۴۳

۹۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' مشمولہ معاصر (انٹرنیشنل)، عطاء الحق قاسمی (مدیر)، (لاہور: مارچ ۲۰۰۵) ص ۵۴۷، ۵۴۸

۱۰۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۴ء) ص ۸، ۹

۱۱۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۸ مئی ۲۰۰۳

۱۲۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' مشفق خواجہ کا خط انور محمود خالد کے نام مشمولہ ''معاصر'' (انٹرنیشنل)، عطاء الحق قاسمی (مدیر)، (لاہور: مارچ ۲۰۰۵ء) ص ۵۵۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۵۶

۱۴۔ نوائے وقت لاہور ۱۰ جنوری ۲۰۰۳

☆☆☆

باب ہفتم: خلاصہ مباحث، اہل قلم کا ردعمل واسلوب

(ا) خلاصہ مباحث

(ب) اہل قلم کا ردعمل (ترجمہ، تبصروں اور تقاریب کے حوالے سے)

(ج) اسلوب

(الف)

خلاصہ مباحث

کتاب ''اپنا گریباں چاک'' جاوید اقبال کی سوانح عمری کئی حوالوں سے اردو کے سوانحی ادب میں انفرادیت کی حامل ہے۔ ایک حوالہ تو یہ ہے کہ یہ جاوید اقبال کی سوانح عمری ہے جو علامہ اقبال کے صاحبزادے ہیں جنہیں علامہ اقبال نژادِ نو اور نئی نسل کے حوالے سے کئی جگہ یاد کرتے اور دعا دیتے ہیں۔ علامہ کو جو توقعات آنے والی نسل سے تھیں ان کا اظہار جاوید اقبال کے نام اشعار میں ہوا ہے۔ علامہ اقبال کے حوالے سے جاوید اقبال ہمیشہ اقبال دوستوں کے مطالعے میں رہیں گے لہٰذا اس کتاب کی پہلی اہمیت یہی نسبتِ خاص ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' کی دوسری اہمیت اس کا دلچسپ اسلوب ہے۔ یہ کتاب چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپے، اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا۔ مختلف اہل قلم نے اس کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اس کتاب کے حوالے سے کئی تقریبات کا انعقاد ہوا، جن میں مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، یہی اسلوب اس کتاب کی عطا ہے۔ اختلافی امور و مسائل کو چھوڑ کر جاوید اقبال کے دلچسپ اسلوب کے حوالے سے اس کتاب کو ہمیشہ پڑھا جاتا رہے گا اس باب میں ہم ''اپنا گریباں چاک'' کے انہی منفرد پہلوؤں کا جائزہ لیں گے جن کا تعلق اہلِ قلم کا ردِّ عمل، اس کتاب کے اسلوب اور اس نسبت سے اردو ادب (خصوصاً سوانح عمریوں) میں جاوید اقبال کے مقام و مرتبہ سے ہے۔

آپ بیتی ایک لحاظ سے ادب کی دلچسپ ترین صنف ہے۔ اس میں شخصیت کے ایسے مظاہر ملتے ہیں جن سے مصنف سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے صدہا ایسے اسرار ہیں جن سے بیرونِ در کا کوئی آدمی باخبر ہو سکتا ہی نہیں۔ آپ بیتی کی بنیادی چیز سچائی ہوتی ہے۔ جو ایک فرد کی تصویر کو واضح صورت میں ہمارے سامنے

لاسکتی ہے یہ تصویر جامد اور ساکت نہیں ہوتی بلکہ رواں دواں اور جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے۔ایک فرد کی تصویر اس کی پوری دنیا' دنیا میں گزرے ہوئے شب و روز میں پیش آنے والے ہر طرح کے واقعات' نفسیاتی الجھنیں اور کشمکش 'سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز' جذباتی محرکات وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے، جسے آپ بیتی کے ذریعے مکمل طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ایک جاندار آپ بیتی میں لکھنے والے کے ماتھے کی تیوریاں' اس کا تبسم زیرِ لب بھی نمایاں ہوتا ہے اور اس کے ذہن کی وسیع دنیا میں سمائے ہوئے خیالات بھی' اس کے علاوہ دل کی دھڑکنوں کی آواز بھی سنی جاسکتی ہے، یعنی خارجی اور داخلی زندگی کی پوری عکاسی اس میں دیکھی جاسکتی ہے مگر سب سے بڑی شرط وہی سچائی اور خلوص ہے اور بے باکی ہے۔ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ ہر طرح کی خصوصیات ایک آپ بیتی میں نظر آسکیں۔اس کام کی دشواری کا اندازہ تو اتنی سی بات سے ہوسکتا ہے کہ ہم کبھی یہ سوچیں کہ ہم اپنی زندگی پھر سے مرتب کر رہے ہیں۔اگر سوچا جائے تو ہم میں سے کتنے ہوں گے جو اس فرمان پر لبیک کہہ سکیں جس میں ہمیں اپنی زندگی کی کہانی من وعن بیان کرنے کے لیے کہا گیا۔

انسان کی فطرت میں ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر اسے اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے اور وہ یہ بھی گوارا نہیں کرسکتا کہ اس میں بھی عام انسانوں جیسی خامیاں ہوں۔جہاں آپ بیتی لکھنے والا اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہے، وہاں اسے اپنا قلم سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے اور دوسری طرف اس کے پڑھنے والے کو اس وقت پڑھنا ناگوار اور دشوار ہوجاتا ہے۔جب کہنے والا اپنے متعلق ذرا سی خوبی یا تعریف سے متعلق کوئی جملہ کہے۔ویسے یہ بات بھی صحیح ہے کہ آپ بیتی لکھنے والے کی اپنی دانست میں کڑی سے کڑی تنقید بھی عموماً اوروں کو خود پسندی نہیں تو کم سے کم فراخ دلی' رعایت، نظر اندازی اور پہلوتہی کے مترادف نظر آتی ہے۔

اپنی خود پسندی اور اپنے متعلق غلط اندازے لگانے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا اس بات پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اپنے بیان میں سے روزمرہ زندگی کی عام خصوصیات نکال دے اور اپنے آپ کو خالصتاً نمایاں واقعات و اعمال تک محدود رکھے۔انسان اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے اپنی ہر بات کو تحریک ساز رویّہ بنا دیتا ہے۔

انسان کا ذہن بڑا وسیع نظام رکھتا ہے۔یاد رکھنے کی فضیلتیں انسان میں موجود ہیں مگر گزری ہوئی زندگی اور

زندگی سے متعلق ہر بات کا یاد رہنا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ اگر سب کچھ یاد رہ بھی سکتا ہو تو انسانی فطرت کچھ ایسی ہے کہ انسان اپنے دماغ کو جھٹک کر بھی ایسے ناپسندیدہ واقعات اور ناخوشگوار باتیں نکال دینا چاہتا ہے جن کو یاد رکھنے میں اسے تکلیف اور چبھن محسوس ہوتی ہے۔ پھر انسان کو بچپن کی بھی بہت سی باتیں بھول چکی ہوتی ہیں۔ ایسے میں ماں باپ یا دیگر لوگوں سے سنے سنائے حالات کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کا کوئی بھی غلط اشارہ اس کے لیے قابلِ گرفت ہوسکتا ہے۔

جہاں انسان بھول جانے کی فطرت رکھتا ہے وہاں اس سے متعلق ایک اور چیز بھی ہے کہ بھولے ہوئے واقعات کی جگہ ذہنی اختراعات کو دے دی جاتی ہے۔ انسان ذہن کی مدد سے بھولی ہوئی تصویروں کی بجائے نئی نئی تصویریں بنا کر اپنی تصویر کو رنگین بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دماغ دلیل و جواز اور لیت و لعل سے کام لینے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ بعض دفعہ انسان زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرتا ہے اور تصور و تخیل کی آباد کردہ دنیا میں رہتا ہے۔ اگر وہ آپ بیتی لکھے تو اس میں ایک مثالی کردار اور مثالی دنیا کا نقشہ سامنے آجائے گا۔ روزمرہ کی ڈائری انسان کو آپ بیتی لکھنے کی ترغیب کے علاوہ اس کام کو بطریق احسن انجام دینے میں مدد دے سکتی ہے۔

جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' فقط ان کی داستانِ حیات نہیں ہے بلکہ بیسویں صدی کے بنتے بگڑتے انسانی رویّوں، تہذیب، معاشرت اور سیاست کے بعض رجحانات کی عکاس بھی ہے۔ ''جنم پتری'' سے لے کر ''خودکلامی'' تک یہ کتاب تیرہ (۱۳) ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کی تفصیل درج ذیل ہے:

باب ۱: جنم پتری

باب ۲: چند ابتدائی سال

باب ۳: جاوید منزل

باب ۴: اپنے آپ کی تلاش

باب ۵: انگلستان

باب۶: پاؤں میں چکّر

باب۷: خانہ آبادی

باب۸: عدل گستری

باب۹: نظریہ سے انحراف

باب۱۰: عدالت عظمیٰ کے تین برس

باب۱۱: مستقبل کی تعمیر

باب۱۲: سفر جاری ہے

باب۱۳: دوسرا خط' خود کلامی

ہر باب جاوید اقبال کی حیات اور فکر کی جدا داستان ہے۔ جاوید اقبال کی زندگی کے ابتدائی سال اور جاوید منزل کے حوالے سے ملنے والی معلومات اس اعتبار سے بھی اہم ہیں کہ یہ ایک عظیم باپ کے بیٹے کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ پیش لفظ میں مصنف نے اقبال کو ایک ایسے درخت سے تشبیہہ دی ہے جس کے سائے سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنا ایک مشکل امر ہے اور جاوید اقبال تمام عمر اسی کوشش میں سرگرداں رہے ہیں۔ درج ذیل اقتباس دیکھئے:

''مَیں نے کن حیلوں سے ایک بہت بڑے درخت کے سائے سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تگ و دو کے اس عالم میں کیا مَیں اس سائے سے نکل کر اپنا سایہ بنا سکا؟ مَیں کس حد تک کامیاب ہُوا اور کس حد تک ناکام؟ فقط یہی میری داستانِ حیات ہے۔''(۱)

جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں ابتدائی زندگی کے حالات و واقعات کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ واقعات ان کے گھریلو ماحول' دوست احباب' تعلیم و تربیت اور بچپن کی حسین یادوں سے متعلق ہیں۔ بعض اوقات جاوید اقبال کی وجہ سے ان کے والدین میں جھگڑا بھی ہو جاتا۔ ان کی والدہ کو یہ فکر تھی کہ وہ جب بھی اکیلے کھانا کھائیں پیٹ بھر کر نہیں کھاتے۔ اس لیے وہ ہمیشہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتیں۔ جاوید اقبال کی عمر آٹھ نو برس کی ہوگئی مگر یہ عادت ختم نہ ہوئی۔ اقبال اپنی بیگم پر خفا ہوتے کہ بیٹے کی

عادتیں بگاڑ رہی ہو اگر یہ جوان ہو کر بھی خود کھانا نہ کھا سکا تو پھر کیا ہوگا؟ اقبال کے ڈر کی وجہ سے جاوید کی والدہ احتیاطاً جاوید کی پلیٹ میں چمچہ رکھ دیتیں لیکن کھانا خود ہی کھلاتیں۔ پلیٹ میں چمچہ اس لیے رکھا جاتا کہ اگر کبھی اقبال زنان خانے میں داخل ہوں تو جاوید چمچ سے کھانا شروع کر دیں۔

اقبال کی زندگی میں جاوید اقبال کو اپنے باپ کی شفقت اور محبت کا اندازہ نہ ہو سکا اور وہ اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ وہ عام انسانوں کی طرح اپنے بیٹے کو پیار سے بھینچتے یا انہیں گلے سے نہیں لگاتے تھے۔ اقبال بظاہر کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ جاوید اکثر اوقات انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کیے اپنے خیالات میں مستغرق پاتے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہیں اپنے بیٹے سے محبت نہیں تھی۔ ان کی محبت کے اظہار میں ایک انفرادی خاموشی تھی جسے سمجھنا جاوید کے لیے مشکل تھا۔ جاوید اپنے باپ سے محبت کم کرتے تھے اور خوف زیادہ کھاتے تھے۔

اقبال کی وفات کے بعد جاوید کی زندگی مکمل آزاد ہوگئی۔ وہ ہر قسم کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہو گئے۔ جن باتوں سے اقبال نے انہیں منع کیا تھا وہ انہوں نے بڑی کثرت اور بڑے شوق کے ساتھ اپنا لیں۔ نیکی اور بدی میں سے بدی کا راستہ منتخب کیا۔ اقبال کی زندگی میں سرِ شام گھر موجود رہنے کا حکم تھا ان کی وفات کے بعد جاوید آدھی آدھی رات تک گھر نہ آتے۔ پہلے سینما دیکھنا منع تھا' اب روز دو دو تین تین شو دیکھے جاتے۔ روزمرہ کے باورچی خانہ کے حساب کے پیسوں میں گھپلے کرتے۔ رنگ برنگی ریشمی قمیضیں' ولایتی بوٹ اور یورپی لباس پہنتے۔ اگر کبھی اچکن پہننی پڑ جاتی تو وہ بھی بہترین درزی کی سلی ہوتی۔ مشہور دکانوں سے شاپنگ کی جاتی۔ بڑے اور معروف ریستورانوں میں وقت گزارا جاتا۔ مے نوشی' یورپی طرز کے رقص و سرود سے دل بہلایا جاتا۔

جاوید کے نزدیک نیکی اور بدی یا گناہ اور ثواب کے بارے میں ایسے عقیدے پر اعتماد کرنا چاہیے جو تخیلی کی بجائے عملی ہو۔ ان کا فلسفہ ہے کہ اپنی انا پر اعتماد کرنے والا انسان بدی کا راستہ اختیار کر کے اس سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔ جاوید کے نزدیک ایسا شخص بے وقوف ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو یا بدی کا راستہ اختیار نہ کیا ہو یا جو فرشتہ صفت ہو۔ انسان بدی اور گناہ کی دلدل سے قوت ارادی کے زور ہی سے نکل سکتا ہے لیکن جاوید کی رائے میں یہ

خصوصیت مستقل طور پر صرف پیغمبروں یا اولیاء اللہ کو ہی نصیب ہوئی ہے اور انسان کے لیے ایسا ممکن نہیں ہے ۔انسان کی تمام زندگی نیکی اور بدی کے راستوں پر سفر میں گزر جاتی ہے۔

زمانۂ طالب علمی کے حوالے سے ایف اے کے مضامین میں انگریزی، عربی، جغرافیہ اور اردو کے مضامین اہم تھے۔اردو میں ''مسدّس حالی'' کورس میں شامل تھی۔جاوید کے عربی کے استاد مولوی کریم بخش تھے۔جاوید نے بی اے میں انہی مضامین کے ساتھ جغرافیہ آنرز کا مضمون بھی لیا۔صوفی تبسم اساتذہ میں شامل تھے۔جاوید زمانۂ طالب علمی میں عیش وعشرت میں غرق رہے۔ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری موٹر کار بدلنے کا شوق رہا۔بی اے میں چودھری محمد حسین سے ''دیوانِ غالب'' پڑھنے کا اتفاق ہُوا تو جاوید کی کایا پلٹ گئی۔وہ فکری طور پر چودھری صاحب کے زیرِ اثر آ گئے۔بعد ازاں چودھری محمد حسین نے جاوید کو ''خطاب بہ جاوید'' پڑھا کے ان کی اقبال شناسی کی ابتدا کی۔

پہلے باب کا آغاز جس ماڈرن ازم، روشن خیالی اور صاف گوئی سے کیا گیا ہے، اس کی توقع جاوید اقبال جیسے شائستہ اور مہذب انسان سے ہرگز نہ تھی:

> ''اپنی پیدائش کے عمل کو کوئی دیکھ تو نہیں سکتا۔اس بارے میں خبر پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔''(۲)

جاوید اقبال کے لاشعور میں یہ بات ہمیشہ سے موجود رہی ہے کہ ایک نامور باپ کی اولاد کی حیثیت سے اُن کی ذات میں ایک ہیرو کی صفات موجود ہیں اور وہ کسی غیر معمولی عہدے اور منصب کے حق دار ہیں۔وہ کسی عام خاندان کے فرد ہوتے تو شاید خود شناسی کا یہ عمل خاصی حد تک مختلف ہوتا۔ان کا یہ موقف کہ انسان ''شر'' سے ماورا نہیں ہوسکتا بلکہ ''شر'' کے چنگل میں پھنس کر ہی اچھائی اور خیر کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے بھی قابلِ توجہ ہے۔علامہ کی وفات کے بعد انہوں نے ہر اس عمل کو اپنایا جس سے اقبال نے انہیں اپنی زندگی میں منع فرمایا تھا۔جاوید اقبال کو اپنے اس طرزِ عمل کے اظہار میں کسی قسم کی ندامت نہیں۔

ایک ایسے دور میں جب اقبال مخالفوں کا سیلاب اُمڈا پڑا ہے۔بعض لوگ اپنی سیاست چمکانے کے لیے

اُن کی مخالفت بطور فیشن کر رہے ہیں' جاوید اقبال کو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اپنانا چاہیئے۔ ''اپنا گریباں چاک'' میں بعض ایسے قبل از وقت (Pre-mature) اذکار موجود ہیں جو نامکمل فکری مبحث اور ادھورے مکالموں کی صورت میں سامنے آئے ہیں' سوانح حیات میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

''اپنا گریباں چاک'' کی ایک خامی یہ ہے کہ اس میں بعض شخصیات کی پری میچور انٹری کی گئی ہے جبکہ بعض اہم پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے جیسے جاوید اقبال نے علامہ اقبال کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا لیکن اپنی اس آپ بیتی میں وہ جا بجا اپنی بیوی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ رجحان حیرت انگیز حد تک تکلیف دہ ہے۔ انہوں نے لاشعوری طور پر اپنی بیوی کی برتری کو تسلیم کیا ہے اور اس کتاب میں بعض ایسے گھریلو معاملات اور مسائل کو شامل کیا ہے جن کی شمولیت غیر ضروری نظر آتی ہے۔

جاوید اقبال کی اہلیہ ان کی فکری شخصیت پر ایک غالب فرد کے روپ میں سامنے آئی ہیں اور خاوند کی شخصیت پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتی نظر آتی ہیں۔ جاوید اقبال اپنے والد کی بجائے اہلیہ کے خیالات سے زیادہ متاثر ہیں۔

ایک ایسا شخص جس نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے۔ اپنے مشاہدات اور تجربات کی بدولت بہت سے حقائق دریافت کیے اور اپنی شناخت کی مسلسل جستجو کی' تنہائی کے لمحوں میں کیا سوچتا ہے؟ یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ ایک غیر معمولی انسان کی خودکلامی صرف چار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے ایک شخصیت کے فکری خدوخال کے تعارف کا آغاز ہو رہا ہے۔ ایک اصل شخصیت نامہ دراصل یہاں سے شروع ہونا چاہیئے تھا جہاں اسے ختم کر دیا گیا۔ جسمانی سفر کی داستان کے بعد فکری سفر کو انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اگر یہ خودکلامی ادھوری ہے تو اسے کتاب میں شامل کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ اور اگر یہی خودکلامی جاوید اقبال کی زندگی کا حاصل ہے تو اسے کیا سمجھا جائے؟ مذہب اور شخصی آزادی کی کشمکش' پاکستان کے لسانی' نسلی' علاقائی اور فرقہ وارانہ مسائل کی بحث اور قیامِ پاکستان کے جواز کو 'خودکلامی' سے خارج کر دیا جائے تو جاوید اقبال کی ذات کا کوئی واضح عکس نظر نہیں آتا۔

جاوید اقبال بعض مقامات پر ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو علامہ اقبال جیسی مذہبی شخصیت کی اولاد کے منہ سے جچتی نہیں مثلاً وہ اسلام کے حوالے سے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور بعض قسم کی صورت حال میں لبرل ازم کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں جو خاصی تکلیف دہ بات ہے۔ دوسرے ممالک میں جب چند افراد نے قبول اسلام کی خواہش کا اظہار کیا تو اس موقع پر جاوید اقبال کی باتیں بلا جواز نظر آتی ہیں۔

جاوید اقبال نے اپنی ذات کی بہت سی صداقتوں کو تحریر کے قالب میں ڈھالنے سے گریز کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ تو وہی بہتر جانتے ہیں۔ ''اپنا گریبان چاک'' میں سوانحی ہم آہنگی ("Biographical co-herence") کا فقدان ہے۔ مختلف موضوعات کی پیشکش میں کسی ترتیب کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔ عجلت کے باعث آپ بیتی کے اصول اور تقاضے پورے نہیں کیے جا سکے۔ یہ آپ بیتی گورکی، ٹالسٹائی، رالف رسل اور قرۃ العین حیدر کی آپ بیتیوں کے معیار کی ہرگز نہیں۔ جاوید اقبال نے اپنی زندگی کے بعض ادوار پر زیادہ توجہ دی ہے اور بعض معاملات کو بالکل نظر انداز کیا ہے۔ اسی عدمِ توازن کے سبب ''اپنا گریباں چاک'' کہیں کہیں قاری پر اپنی مضبوط گرفت قائم کرنے میں ناکام رہی ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' میں اکثر مقامات پر اسلوب نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ بعض مقامات پر جاوید اقبال کی نثر میں نظم کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ نثر کی اعلیٰ ترین صورت ہے اگرچہ ایسے مقامات بہت زیادہ نہیں جہاں جہاں یہ انداز نظر آیا ہے کتاب میں قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہُوا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کر آئے ہیں لیکن یہاں اس بات کا دہرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ:

> ''۔۔۔ ''کیا آپ کے ہاتھوں میں ستارے ہیں؟'' میں نے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کھول دیئے۔ کہنے لگی: ''آپ کے ہاتھوں میں ستارے نہیں کیونکہ آپ مزدوری کے لیے اپنے ہاتھ استعمال نہیں کرتے۔'' پھر اپنے ہاتھ کھول کر مجھے دکھائے جن میں مشقت کے سبب گٹھے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ ستارے آپ کے ہاتھوں میں کیسے آ گئے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنے سکول

میں پڑھائی کے بعد روز تین گھنٹے زمین کی گوڈی کرتی ہوں۔اس میں بھل ڈالتی ہوں، سبزیاں اگاتی ہوں، انہیں پانی دیتی ہوں۔میرے ہاتھوں میں ستارے اسی مزدوری کا انعام ہیں۔'' (۳)

کتاب کے آخر میں جو تصاویر شامل کی گئی ہیں اُن میں اقبال کے حوالے سے چند اہم تصاویر شامل کی جاسکتی تھیں مگر جن پر توجہ نہیں دی گئی۔ جاوید اقبال نے اپنی جوانی میں موٹر کاروں کے شوق اور مغرب پرستی کے رجحانات کو بھی تصویروں سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔قیامِ یورپ کے عنوان سے دی گئی کئی تصاویر محض چند بے نام مغربی خواتین کی باتصویر شمولیت تک محدود ہیں۔اکثر تصویروں کی کتاب میں شمولیت بلا جواز ہے۔قیوم نظامی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تصاویر اور دوسرے امور کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''تصویرِ بتاں کو اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے جن کا کوئی جواز نہ تھا۔کتاب کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال کی روح ضرور بے چین اور بے قرار ہوئی ہوگی۔افسوس جاوید اقبال نے علامہ کے مداحوں اور عقیدت مندوں کے جذبات کا احساس بھی نہ کیا اور سرِ عام ''اپنا گریباں چاک'' کر کے اس مقام سے بھی گر گئے جو انہیں عظیم باپ کی وجہ سے ملا تھا۔کتاب کی قیمت چھ سو روپے ہے جو متوسط طبقے کی قوت خرید سے باہر ہے۔کتاب میں اگر تصویروں کی بھرمار نہ ہوتی، جلد بندی کے لئے موٹا گتہ استعمال نہ کیا جاتا اور موٹا ٹائپ استعمال نہ ہوتا تو کتاب تین سو روپے میں بھی شائع ہو سکتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پبلشر نے کتاب کو گریس فل بنانے کی کوشش کی ہے خامیوں کے باوجود یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔'' (۴)

ان تمام حقائق کے باوجود کتاب کا اختتام جو سورۃ الناس پر کیا گیا ہے قابلِ ستائش ہے۔یہ اس امر کی گواہی ہے کہ مسلمان اپنی زندگی میں جن بھی کوتاہیوں اور غفلتوں کا مرتکب ہو وہ خاتمہ بالخیر پر یقین رکھتا ہے اور اس کے نزدیک دراصل رحمتِ خداوندی کی یہی طلب اس کا زادِ راہ ہے۔

اشفاق احمد ''اپنا گریباں چاک'' پر منعقدہ ایک تقریب کے دوران اپنے خیالات کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں کہ:

''اس کتاب کی تحریروں میں ایسا سحر ہے کہ جو ایک مرتبہ پڑھنا شروع کر دے ختم کیے بغیر دم نہ لے۔ اس کتاب میں سب سے متاثر کن چیز ''خود کلامی'' ہے اور پہلے کبھی اس طرز کی تحریر میرے مطالعے سے نہیں گزری۔ اس سے قبل کسی نے اپنے آپ سے ایسے سوالات نہیں کیے جن کا تعلق حالات و واقعات سے ہو، ایسے سوالات ایک بڑی سوچ کے فلسفی ہی اپنی ذات سے کرتے ہیں۔''(۵)

''اپنا گریبان چاک'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے جس باوقار، صاف گو اور مضبوط اعصاب کے مالک انسان کی حیثیت سے تمام مراحل طے کیے ہیں اور دروغ گوئی، عظمت کے بیان اور بے جا قصیدہ گوئی سے پرہیز کیا ہے وہ واقعی قابلِ داد ہے۔ ایک عظیم شخصیت کے فرزند کی حیثیت سے جاوید اقبال نے اپنے دل و دماغ کی سرگزشت کو اس آپ بیتی میں نہایت موثر اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے بہت زیادہ تنقیدی آرا یا مضامین نہیں لکھے گئے لیکن جن چند ناقدین کی آرا ملتی ہیں اُن سے ایک دلچسپ بحث کا آغاز ضرور ہوتا ہے۔ مایہ ناز محقق اور نقاد مشفق خواجہ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بلاشبہ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے، اپنے مواد اور اسلوب تحریر دونوں کے اعتبار سے۔ اس کا بنیادی وصف Readability ہے۔ کتاب پہلے ہی صفحہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور جوں جوں کتاب آگے بڑھتی ہے، یہ گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ مَیں نے یہ خوبی بہت کم کتابوں میں پائی ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی ایسی بھی ہے جو اردو زبان کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ یہ کتاب صرف لفظوں ہی میں نہیں لکھی گئی، تصویروں میں بھی بیان کی گئی ہے۔ مصنف نے جتنا کچھ لفظوں میں کہا ہے، اس سے کہیں زیادہ تصویروں کی زبانی بیان کر دیا ہے۔ خصوصاً ان بے نام ــــــــــــــــ''(۶)

''اپنا گریبان چاک'' کا ایک نمایاں وصف ڈاکٹر جاوید اقبال کی بے باکی ہے۔انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ ایسی تمام باتیں اس آپ بیتی میں لکھ دی ہیں جو کوئی دوسرا کہنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔عموماً مصنف معاشرتی اور اخلاقی دباؤ کے زیر اثر جرأتِ اظہار سے محروم ہو جاتا ہے لیکن ''اپنا گریبان چاک'' ایک ایسے بہادر انسان کی آپ بیتی ہے جو اپنے بارے میں بہت کچھ کہنے کی جرأت رکھتا ہے۔

اس آپ بیتی پہ جو اعتراضات ہوئے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مصنف نے بڑے دلکش انداز میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ لڑکیوں کے ہوسٹل میں بغیر گرفت میں آئے' پوری پوری راتیں گزارتے تھے۔ایک اور مقام پر جاوید اقبال کا اندازِ بیان طبع پر گراں گزرتا ہے جب وہ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کی عائد کردہ پابندیوں کو توڑ کر آسودگی حاصل کی۔اسی حوالے سے مشفق خواجہ کی درج ذیل رائے دیکھئے:

''یہ اس جاوید اقبال کا حال ہے جس کے لیے اقبال نے یہ دعا کی تھی:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

علامہ اقبال کی دعا قبول ہوئی مگر صرف کپڑوں کی حد تک۔عزیز موصوف نے کیسے کیسے بے داغ لباس زیب تن کیے!انھیں جاوید اقبال کو علامہ نے نصیحت بھی کی تھی

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

جاوید اقبال نے اس نصیحت پر لفظاً و معناً عمل کیا۔پہلے یہیں لاہور میں اور پھر انگلستان جا کر۔علامہ لفظ 'عشق' کو جن وسیع اور بلند معنوں میں استعمال کرتے ہیں' جاوید اقبال کو ان سے سروکار نہیں تھا' ان کے ہاں یہ لفظ ان معنوں میں مستعمل رہا جن معنوں میں حالی کے اس شعر میں آیا ہے:

اے عشق تُو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا 'اس کو بٹھا کے چھوڑا

علامہ نے انھیں یہ نصیحت بھی کی تھی:

مَیں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

''غزل سے مے لالہ فام پیدا کرنا خاصا پیچیدہ اور مشکل کام تھا جسے مال روڈ لاہور کے ہوٹلوں نے خاصا آسان کر دکھایا۔ان جملہ ہائے معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ہاں تو بات ہو رہی تھی والد کی وفات کے بعد فرزندِ ارجمند کی آزادہ روی کی۔لاہور میں پھر انگلستان میں بھی انھیں حسنِ بازار سے لے کر حسنِ بزم خاص تک سے محظوظ ہونے کے مواقع ملے اور بالآخر ہر طرح کے بازاروں سے گزرنے کے بعد یہ نظریہ قائم کیا: ''ایسا شخص جس نے گناہ نہ کیا ہو یا بدی کا راستہ اختیار نہ کیا ہو یا جو فرشتہ سیرت ہو' عموماً بے وقوف ہوتا ہے'' (ص ۵۰) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی دانش مندی یا دانش وری بے بنیاد نہیں ہے۔اسی دانش مندی نے اس زمانے میں بھی جب وہ انصاف کی کرسی پر اور ہاتھوں میں انصاف کا ترازو لیے ہوئے بیٹھے تھے' ان کو اس قسم کے نظریات پر ثابت قدم رکھا ''جنرل ضیاء الحق کے دور میں پی سی او کے تحت۔۔۔۔جن جج صاحبان نے اصولاً حلف نہ اٹھایا' وہ بھی اپنی جگہ درست تھے' اور جنھوں نے آمر کے حکم پر حلف اٹھا لیا' وہ بھی غلط نہ تھے۔'' (ص ۲۱۶) اسی کو کہتے ہیں: رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔'' (۷)

مشفق خواجہ اپنے خط میں جاوید اقبال کی بے باکی پر اس انداز میں تبصرہ کرتے ہیں کہ:

''جاوید اقبال کی بے باکی اکثر مقامات پر ناگوار محسوس ہوتی ہے مثلاً ہم جنس پرست لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان گھومنے (ص ۸) اور ساری ساری رات رقص کرنے (ص ۹) کی تفصیلات۔بے باکی کی انتہا دیکھیے کہ وہ اپنے خیالات کی تائید میں علامہ اقبال کے

اشعار پیش کرتے ہیں ایک مقام پر لکھتے ہیں

''لڑکیاں جو کیمبرج میں میری واقف بنیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق مصوری، مجسمہ سازی یا ساز سنگیت ہی سے تھا۔ ان میں بعض تو بے حد خوبصورت تھیں، گویا ہاتھ لگانے سے ان کے میلے ہو جانے کا امکان تھا مگر بقول علامہ اقبال:

چوں نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من، پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ' ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

علامہ اقبال نے جو بات ایک وسیع تر تناظر میں کہی، جاوید اقبال نے اسے محدود کر دیا اور پہلے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنے مزاج کو ملحوظ رکھا۔ لکھتے ہیں:

''میری نگاہ جب کسی ماہ جبین کے حسن پر پڑتی ہے تو اسی لمحے میرا دل اس سے بھی خوب تر کسی حسینہ کے لیے دیوانہ وار خواہش کرنے لگتا ہے۔''

جاوید اقبال کی بے باکی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

''۔۔۔۔ایک خاتون لفٹ میں داخل ہوئیں جنھوں نے نہایت بیش قیمت فرکوٹ (پوستین) زیب تن کر رکھا تھا۔ فرکوٹ شاید اتفاقاً یا دیدہ دانستہ طور پر سامنے سے سرک گیا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھیں۔ صرف جوتے پہن رکھے تھے۔ میرے دل سے فوراً نکلا: اصل جمہوریت تو امریکہ ہی میں ہے۔''(۸)

مشفق خواجہ جاوید اقبال کی عدلیہ کی تصویر کشی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''اپنا گریبان چاک'' کا وہ حصہ جس میں جاوید اقبال نے اپنے عدالتی زندگی کے تجربات و مشاہدات بیان کیے ہیں بے مثل ہے۔ انھوں نے عدلیہ اور اس کے ارکان کی

جو تصویر کشی کی ہے وہ عبرت ناک بھی ہے اور ہماری قومی زندگی کے زوال کا منہ بولتا ثبوت بھی۔ گزشتہ پچاس برس میں ایسی تصویر کشی شاید ہی کسی صاحبِ قلم نے کی ہو۔ اگر جاوید اقبال اس قصے کو مزید طویل کرتے تو زیادہ لطف آتا اور تشنگی بھی کم ہو جاتی۔'' (۹)

اپنا گریباں چاک'' میں زبان و بیان کی اغلاط کے بارے میں مشفق خواجہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''بعض مقامات پر جاوید اقبال نے زبان و بیان کے حوالے سے مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''کوٹھی کا داخلہ لکڑی کے چھپر کھٹ والے بڑے برآمدے کے ذریعے تھا شاید مصنف کے ذہن میں چھپر کھٹ کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ چھپر کھٹ اس پلنگ کو کہتے ہیں جس پر چھت اور پوشش ہو یا چھتری والے پلنگ کو کہتے ہیں جو دلہن کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر اقبال کے جنازے کی تفصیلات کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ سے جنازہ خراماں خراماں چلتے ہوئے'' (ص ۱۵) اگر انھیں خراماں خراماں کے معنی معلوم ہوتے تو وہ ایسا نہ لکھتے۔ یہ الفاظ محبوب کی خوش رفتاری اور اٹھلا کر چلنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ایک اور مقام پر شاید یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی شخص کام میں دلچسپی نہیں لیتا۔ لکھتے ہیں: ''یہاں کوئی بھی شخص دل لگی سے کام نہیں کرتا

کتاب میں کتابت یا کمپوزنگ کی غلطیوں سے ہٹ کر املا کی اغلاط بھی کثرت سے ہیں۔ صوفی کی غلط جمع صوفیا (ص ۱۷) صحیح (صوفیہ) برخواست (ص ۱۸) (صحیح۔ برخاست)، معرکۃ الآرا (ص ۱۹) بجائے معرکہ آرا، دوشامبے (ص ۲۰) بجائے دوشنبہ، ذق پہنچے (ص ۲۱) بجائے زک پہنچے، حامی بھری (ص ۲۲) بجائے ہامی بھری وغیرہ۔

زبان و بیان کی اغلاط کی چند مزید مثالیں درج ذیل ہیں۔

''بچپن میں مجھے ٹائی فائیڈ (مہلتی بخار) چڑھا''

درست روزمرہ ''ٹائیفائیڈ ہوا'' ہے نہ کہ چڑھا۔

''بڑھاپے کے سبب پہلے تو جسم میں دردیں نکلنی شروع ہوتی ہیں۔''

اردو میں درد مذکر ہے اور یہ جمع میں استعمال نہیں ہوتا۔ محاورہ ''درد ہونا'' ہے۔ نکلنا نہیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر وہ لکھتے ہیں: ''اتنے بڑے بڑے کمرے تھے کہ مجھے رات کو ان میں سے گزرتے ڈر آیا کرتا''

محاورہ ڈر آنا نہیں ڈر لگنا ہے۔ لہٰذا یہ ہونا چاہیے ڈر لگا کرتا۔

''میں نے اپنی نقل وحرکت کے لیے ایک چھوٹی موٹر کار فوکس ویگن ماہوار کرایہ پر رکھ لی۔''

نقل وحرکت کی بجائے آمد ورفت زیادہ مناسب لفظ ہے۔

''مجھے اس بات کا رنج تھا کہ انتظامیہ کی ریشہ دوانیوں کے اور رائے عامہ کی عدلیہ کے حق میں عدم موجودگی کے سبب عدلیہ رفتہ رفتہ روبہ تنزل ہے''

اس جملے میں فصاحت متاثر ہوئی ہے اور ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ اس نوع کے چند مقامات اور بھی آتے ہیں لیکن ۲۸۸ صفحات کی خودنوشت میں اتنے زیادہ نہیں کہ طبیعت بوجھل ہو۔'' (۱۰)

قدرت اللہ شہزاد نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی تحریر کے غیر جانبدارانہ اور مؤرخانہ انداز کو سراہا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''آپ بیتی کے توانا لہجے'' میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر جاوید اقبال کی آپ بیتی کا بنیادی وصف غیر جانبدارانہ و مؤرخانہ اندازِ تحریر ہے۔ وہ آنکھوں دیکھے واقعات میں معروضیت کو اولیّت دیتے ہیں۔ کہیں بھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے جس کے باعث ان کی خودنوشت قومی تاریخ کی ترتیب وتدوین میں اہم معتبر ذریعہ قرار دی جا سکتی ہے۔ وہ جہاں بھٹو کی سیاسی شعبدہ بازیوں اور دیگر منفی رویوں کا ذکر کرتے ہیں وہاں ان کی قومی خدمات کا بھی برملا اظہار کرتے ہیں'' (۱۱)

ڈاکٹر جاوید اقبال کی آپ بیتی میں کئی شخصیات کے منتشر اذکار کو اکٹھا کرنے سے ان کے عمدہ خاکے ترتیب دیئے جاسکتے ہیں۔ دوسروں کے حوالے سے صاف گوئی سے کام لینا آسان ہے لیکن اپنے حوالے سے سچ بولنا اور اپنی ذات کا احتساب کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس آپ بیتی میں کئی مقامات پر اپنا محاسبہ کیا ہے۔ وہ خود پر تنقید بھی کرتے ہیں اور تلخ حقائق کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

''اپنا گریبان چاک'' کے حوالے سے مشفق خواجہ کی تنقید اور تبصرے کے جواب میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا ایک خط بھی ''معاصر'' میں شائع ہُوا۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''مشفق خواجہ صاحب کا تبصرہ اپنی نوعیت کا ہے۔ ''اپنا گریبان چاک'' تو میری طرف سے ایک طرح کا ''شکوہ'' تھا مگر انھوں نے ''شکوہ'' کی خامیوں یا خوبیوں پر اکتفا کرنے کی بجائے ''جوابِ شکوہ'' لکھ ڈالا۔ یعنی تمھارا ''شکوہ'' بجا نہیں۔ تم نے محمدؐ سے وفا نہیں کی۔ اس لیے ہم تمھارے نہیں ہیں۔ یہ تبصرہ نما خط نہیں ہے بلکہ ''تبصرۂ نصیحت نما'' ہے۔'' (۱۲)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک سفارت کار، منصف، دانش ور اور سکالر کی حیثیت سے بے شمار اسفار کیے۔ ان کی بے شمار کانفرنسوں کا احوال اس آپ بیتی میں ملتا ہے۔ اسی طرح یہ آپ بیتی ہمیں عدلیہ کے مزاج سے بھی متعارف کراتی ہے اور اس میں عدالتی تاریخ کے اہم ادوار اور بحرانوں کا دیانت دارانہ تجزیہ بھی ملتا ہے۔

''اپنا گریبان چاک'' کی ایک اہم خوبی اختصار اور جامعیت ہے۔ جاوید اقبال نے ملک کے حالات اور واقعات کو نہایت اختصار سے بیان کیا ہے اس طرح انھوں نے قاری کو تکرار سے پیدا ہونے والی اکتاہٹ سے بچالیا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کی آپ بیتی اپنے مزاج کے لحاظ سے اہم ماخذ ہے لیکن بعض مقامات پر ان کی یادداشت نے ساتھ نہیں دیا جس سے حقائق میں گڑبڑ محسوس ہوتی ہے مثلاً:

> ''بھٹو کی مخالف سیاسی جماعتوں کے ''کٹھ'' نے بھی نظام مصطفیٰ تحریک کے تحت ان سے زیادہ مذہبی مطالبات ہی کیے مثلاً احمدیوں کو اقلیت قرار دو، اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی کرو، گھڑ دوڑ پر

جوابند کرو، شراب بند کرو، بھٹو نے اپنی کرسی محفوظ کرنے کی خاطر سب مطالبات مان لیے۔'' (۱۳)

نظامِ مصطفیٰ کی تحریک ۱۹۷۷ء میں چلی جبکہ احمدیوں کو اس سے قبل ۱۹۷۴ء میں ایک الگ تحریک کے نتیجہ میں اقلیت قرار دیا گیا۔ اسی طرح وہ اپنے سامنے پیش ہونے والے ایک کیس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''بہاول پور کے کسی کالج میں ایک طالبہ اپنے پروفیسر سے کسی سوال کا جواب پوچھنے کی غرض سے اس کے کمرے میں گئی۔ اس پر کسی مذہبی جماعت سے تعلق رکھنے والے چند طلباء نے کمرے کو باہر سے مقفل کر دیا اور ساتھ کی مسجد کے امام کو بلوا کر ایف آئی آر میں اس کی گواہی دلا دی کہ اس نے پروفیسر کو کمرے میں طالبہ کے ساتھ زنا کرتے دیکھا ہے۔ دونوں کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔۔۔۔۔۔۔'' (۱۴)

بہاول پور سے وابستہ کوئی بھی شخص یہ سطور پڑھ کے پریشان ہو جائے گا کیونکہ اس زمانے میں بہاول پور ڈویژن میں کوئی ایسا کالج نہیں تھا جہاں مخلوط تعلیم دی جاتی ہو جبکہ مردانہ کالج میں طالبات کی آمد و رفت بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسلامیہ یونیورسٹی میں بھی اس نوع کا کوئی ایسا حادثہ نہیں ہوا جو عدالتِ عالیہ تک گیا ہو۔ اس لیے ڈاکٹر جاوید اقبال کا پہلا جملہ حقیقت سے بعید تر محسوس ہوتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر جاوید اقبال کی معروضیت متاثر ہوتی نظر آتی ہے۔

☆☆☆

(ب)

اہل قلم کا ردِّ عمل: ترجمہ، تبصروں اور تقاریب کے حوالے سے

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

علامہ اقبال کے مذکورہ بالا شعر سے اخذ کئے جانے والے عنوان پر لکھی گئی سوانح کتاب کی اشاعت کے بعد ہماری علمی دنیا میں بھی ذہنوں کے اندر کئی ہنگامے برپا ہوئے۔ اس کی بڑی وجہ جاوید اقبال کی شخصیت اور اس کتاب کا موضوع ہے۔ جو ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی زندگی خاندان اور ان کے افکار و نظریات کے بارے میں بھی کئی طرح کی معلومات رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کتاب جاوید اقبال کی اہلیہ اور شائع ہونے والی تصاویر کے حوالے سے بھی علمی اور ادبی حلقوں میں گفتگو کا مرکز بنی۔

علامہ اقبال کی مناسبت سے جاوید اقبال کی اس سوانحی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ حال ہی میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ جس سے اس کتاب کے قارئین کے دائرہ میں ایک دم بہت اضافہ ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ایک تو انگریزی خواں طبقہ کا حلقہ ہے جو اردو سے بہت وسیع ہے۔ دوسرے وہ ادارہ ہے جس نے اسے شائع کیا۔ یعنی یونیورسٹی آکسفورڈ پریس جو صرف پاکستان میں ہی نہیں اپنی کتابوں کو دنیا بھر میں متعارف کرانے کا ایک بڑا اور فوری ذریعہ ہے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کا دنیا بھر میں ایک نیٹ ورک ہے جس کے ذریعے کتاب ہفتوں میں دنیا بھر میں اس کے سٹالوں اور دکانوں کے ذریعے مشتہر کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ حفیظ ملک اور ناصرہ اقبال جاوید اقبال کی اہلیہ نے اشتراک سے کیا۔ حفیظ ملک ولینوا یونیورسٹی (Villanova University) پینسولینیا میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں۔ جہاں

وہ ۱۹۶۱ء سے تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ روسی تدریسی پروگرام کے بھی رکن ہیں اور اسی یونیورسٹی میں عرب اور اسلامی درسیات سے بھی وابستہ ہیں۔ ۱۹۷۷ء سے وہ معروف جنرل آف ساؤتھ ایشیاء اینڈ مڈل ایسٹ سٹڈیز کے مدیر بھی ہیں اور بین الاقوامی احوال و مسائل پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے امریکن انسٹیٹیوٹ آف پاکستان سٹیڈیز قائم کیا اور تقریباً ۱۵ سال تک اس کے ڈائریکٹر رہے۔ ان کی جاوید اقبال سے دوستی قریب قریب نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''اپنا گریباں چاک'' کا ترجمہ محض ترجمہ نہیں یہ ترجمہ جذباتی لگن اور انہماک کا مظہر نظر آتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے اس کتاب کی دوسری مترجم ناصرہ اقبال جاوید اقبال کی اہلیہ ہیں جنہوں نے کیمز ڈ کالج لاہور سے گریجوایشن کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی اور ہارورڈ یونیورسٹی سے ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کی۔ پھر وہ وکالت کے پیشے سے منسلک ہوئیں اور بعد میں لاہور ہائی کورٹ کی جج بھی بنیں۔

وہ خواتین کے حقوق کیلئے بطور سوشل ورکر بھی فعال ہیں اور کئی خیراتی اداروں کی سربراہ بھی ہیں۔ وہ ایڈجیکٹ پروفیسر اور بورڈ آف گریجوایٹ سٹڈیز کی رکن بھی ہیں۔ وہ پنجاب یونیورسٹی لاء کالج، پاکستان لاء اینڈ جسٹس کمیشن مینجنگ کمیٹی، ۵۰۵، چلڈرن کالج اور مکالمہ بین المذاہب انسٹی ٹیوٹ آف تھیالوجی آسٹریا سے بھی منسلک ہیں۔ انہوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کئے سفر کئے اور کئی کانفرنسوں میں اسلام کا پاکستان اور عورت کے مقام پر لیکچر دیئے۔

ترجمے کے دیباچہ میں اردو زبان و ادب میں سوانح عمری کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے یہ زیادہ ثروت مند نہیں ہیں۔ نیز انفرادی سوانح عمری میں معاشرے کی پابندیاں اور خوف کے پیش نظر ادبی جوہر کھل کر سامنے نہیں آیا۔ ترجمہ نگار کے خیال میں اسلامی معاشرے میں اپنے سوانحی حالات میں لکھتے ہوئے زبان کا حقیقت پسندانہ اظہار ممکن نہیں ہے۔ معاشرے میں موجود دورخے پن سے بھی احوال کا درست جاننا اور بیان کرنا مشکل ہے۔ خصوصاً جب ہر گفتگو کرنے والا اپنے آپ کو خاکسار کم ترین اور فدوی کہتا ہے۔ اور اس کا ایسا اظہار عام معمول کا رویّہ ہے ایسے ماحول میں انسان کی اپنی انا خود غرضی منافقت اور خوش گمانی کی اسیر رہتی ہے۔

علامہ اقبال نے انفرادی اور اجتماعی خودی کے جن پہلوؤں کی طرف نشاندہی کی ہے وہ معروضی اور انفعالی ذہنیت کے بالکل خلاف ہیں۔ ہر انسان اپنے آپ میں ایک جسمانی اور نفسیاتی اکائی ہے اور ایک منفرد وجود ہر انسان کا ذاتی تجربہ بھی دوسرے سے مختلف ہے سوانحی عمری میں ایسے تجربات کے اظہار کی گنجائش ہے جن میں زندگی کے حقائق کا اظہار وضاحت کے ساتھ ہوا ہوا گرچہ علامہ اقبال نے اپنے خط میں خود اس امر کا اظہار کیا ہے کہ میری زندگی میں کوئی ایسا خاص واقعہ نہیں رونما ہوا جس سے دوسرے ملک بھی سبق حاصل کر سکیں۔

بقول مسز جمین جاوید اقبال نے اپنی سوانح عمری میں چرچل کے سٹائل کا اتباع کیا ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد سر ونسٹن چرچل نے زمانۂ جنگ کے واقعات اور یادوں کو قلمبند کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ڈینیئل ڈیفوز Daniel Defoes کی یاداشتوں کی طرح اپنے عسکری اور سیاسی واقعات کو اپنے ذاتی تجربوں کے تناظر میں دیکھا بقول ڈاکٹر حفیظ ملک جاوید اقبال نے بھی اسی تکنیک کو استعمال کیا ہے۔

"Javed has followed the same thechnique has used his own nersoval expreiences the events of his life with his father his transition to the hasition of a judge of the Lahore High court and the supreme Court of Pakistan and finally his carrier as a senator to illuminate the historical and intelluctual progression of Pakistan through his life time."(۱)

حفیظ ملک نے جاوید اقبال کے طرز تحریر کے حوالے سے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ ''وہ کس طرح یادوں کے تانے بانے کے گرد آس پاس کے احوال اور زمانے کے واقعات کا بیان کرنے چلے جاتے ہیں'' بقول ان کے :

"Like a symponic composition heshas developed

certain themes around which personality unfolds it self and then developed orientations to words moral and political values which spawned his actions as deliberate inaction events remain enveloped in his personality."(۲)

ترجمے کے ساتھ ساتھ علمی وادبی حلقوں میں بھی اس کتاب کی یہ پذیرائی ہوئی۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام اسلام آباد اور لاہور میں اس کی تعارفی تقاریب منعقد ہوئیں جن میں اہل قلم نے اپنے مقالات ومضامین پڑھے۔ ان مضامین اور خیالات کے ذیل میں چھپنے والے تبصرے اور آرا میں جاوید اقبال کے درج ذیل پہلو زیرِ غور لائے گئے۔

۱۔ ان کے اپنے والد کے ساتھ تعلقات اور علامہ اقبال سے متعلقہ معلومات

۲۔ بطور ایک تہذیبی وثقافتی سفیر جاوید اقبال کی خدمات

۳۔ بطور جج اور پاکستان کے حوالے سے ان کی دوسری خدمات کا ذکر

روزنامہ Dawn کے ایڈیشن ۲ مارچ ۲۰۰۶ میں انتظامیہ نے ''اپنا گریباں چاک'' کی معلوماتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے سٹائل پر بھی بات کی اور اس حوالے سے علامہ اقبال کی زندگی کے بارے میں ملنے والی معلومات کو پاکستان اور اردو کی ملی وقومی تاریخ کا ایک اہم حصہ قرار دیا۔

دوسرے اخبارات ورسائل میں بعد تک یہ کتاب زیرِ بحث رہی۔ ''اپنا گریباں چاک'' کے حوالے سے سب سے دلچسپ مکالمہ سہ ماہی معاصر (جلد ۴ شمارہ ۲، ۳، ۴ اپریل ۲۰۰۴) میں صفحہ نمبر ۵۴۵ تا ۵۵۸ میں شائع ہوا جو ۳ مکاتیب ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر جاوید اقبال اور مشفق خواجہ پر مشتمل ہے۔ اس سے جاوید اقبال اور ان کے سٹائل کے بارے میں کئی دلچسپ اور کارآمد معلومات ملتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۰ جنوری ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر انور سدید نے ''علامہ اقبال آئینہ فرزند میں'' کے عنوان سے اپنے ادبی کالم ادب نامچہ میں ''اپنا گریباں چاک'' پر سیر حاصل تبصرہ کیا کچھ حصہ دیکھئے:

''علامہ اقبال کی دانش وافکار کا مجسم نمونہ پاکستان ہے جو تصورات اقبال کی داخلی بصیرت اور عمل سے فی الوقت محروم ہے۔لیکن بہر حال ایک آزاد مملکت ہے جس کے آئین میں اسے اسلامی ملک قرار دیا گیا ہے اور حقیقی جمہوریت جس کا لائحہ حیات وعمل ہے چنانچہ گزشتہ ۵۵ برس کے عرصے میں تصوّر پاکستان کے اس خالق کو جو ایک عظیم فلسفی اور شاعر تھے ہمیشہ عقیدت کی نظر سے دیکھا گیا اور انہیں عزت اور وقار کے بلند ترین مقام پر فائز کیا گیا کہ ان کا یہ حق اس وقت تک قائم رہے گا جب تک پاکستان اس خطّہ ارض پر وجود ہے۔ان کے قارئین اور نیاز مندوں نے جن میں سید نذیر نیازی،ڈاکٹر عاشق بٹالوی،مولانا عبدالمجید سالک،محمد عبداللہ قریشی،میاں محمد شفیع کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ان کے روز مرہ کے معمولات اور ملفوظات کتابی صورت میں پیش کرنے اور ان کی عظمت کا ایک مستحکم نقش قائم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ''اپنا گریباں چاک'' میں جاوید اقبال نے اقبال کو ایک عام انسان کی صورت میں دیکھنے کی کوشش کی اور متعدد ایسی باتیں بھی منکشف کر دیں جس سے ماہِ کامل بننے والا آدم خاکی اس دنیا کا بالعموم اور خاک لاہور کا بالخصوص ایک ایسا فرد نظر آتا ہے جو بھائی دروازے میں میکلوڈ روڈ پر اور آخری دور میں میورو ڈ پر ایک سیالکوٹی نژاد لاہوری کی زندگی گزار رہا تھا۔تاہم وہ اپنے فکری زاویوں سے پوری آگہی کے باوجود زندگی کی عملیت کا منکر نہیں تھا اس لحاظ سے یہ کتاب علامہ اقبال کے آخری دور کی ایک ایسی عینی شہادت ہے جو فرزند اقبال نے بظاہر اپنے بیان دفاع میں پیش کی ہے اور اس بڑ کے درخت کے حوالے سے جس کا نام علامہ اقبال ہے نکلنے کی سعی کی ہے تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں بھی اقبال علامہ اقبال ہی نظر آتے ہیں اور ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی نظری حیثیت میں اپنی ذات کو جتنا بھی بلند کرنے کی سعی کریں وہ فرزند اقبال ہی دکھائی دیتے ہیں۔''

جنوری ۲۰۰۳ کے آخری ہفتے میں نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن کے تحت ''اپنا گریباں

چاک'' پر ایک تقریب منعقد ہوئی اس کی روداد ملاحظہ فرمائیں۔

ہفتہ رواں کے دوران لاہو میں متعدد تقریبات ہوئیں جن میں سب سے اہم تقریب فرزند اقبال جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح عمری ''اپنا گریباں چاک'' کی تعارفی تقریب تھی جس کا اہتمام نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن نے ایوان کارکنان تحریک پاکستان میں کیا ہے۔صدارت سابق نگران وزیراعظم ملک معراج خالد نے کی مہمان خصوصی وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات شیخ رشید احمد تھے۔ملک معراج خالد نے کہا کہ میری خواہش تھی کہ جاوید اقبال بھی اقبال جیسے نکلیں وہ میری تمام توقعات سے بڑھ کر نکلے ہیں۔اللہ ان کی تڑپ اور لگن میں مزید اضافہ کرے۔پاکستان کو پروگریسو جمہوری اسلامی مملکت بنانے کیلئے ڈاکٹر جاوید اقبال کی اس کتاب سے رہنمائی لی جائے۔شیخ رشید احمد نے کتاب اور صاحب کتاب کو ملک کا بہترین سرمایہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے کتاب کی تخلیق کے دوران جس جرأت اور ہمت سے کام لیا ہے یہ ان کا خاندانی شیوہ ہے انہوں نے کتاب میں اٹھائے ہوئے ایشوز کے حوالے سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ ان پر لے دے تو ہوگی لیکن انہیں اس کامیاب کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔دی نیشن کے ایڈیٹر جناب عارف نظامی نے کتاب کو جدید دور اور اس کے تقاضوں کے عین مطابق قرار دیتے ہوئے کہا کہ مصنف جیسے خود ہیں ویسے ہی ان کی یہ کتاب ہے انہوں نے اس میں مبالغہ آرائی اور جھوٹ سے کام نہیں لیا جو کچھ سوچا سمجھا کہہ دیا وہ ملا کے اسلام کے نہیں لبرل اسلام کے قائل ہیں۔

اشفاق احمد نے کہا کہ ''اس کتاب کی تحریروں میں ایسا سحر ہے کہ جو ایک مرتبہ پڑھنا شروع کردے ختم کئے بغیر دم نہ لے اس کتاب میں سب سے متاثر کن چیز ''خود کلامی'' ہے اور پہلے کبھی اس طرز کی تحریر میرے مطالعے سے نہیں گزری اس سے قبل کسی نے اپنے آپ سے ایسے سوالات نہیں کئے جن کا تعلق حالات وواقعات سے ہو ایسے سوالات ایک بڑی سوچ کے فلسفی اپنی ذات سے کرتے ہیں۔'' تقریب سے محترمہ بشریٰ رحمٰن ،بیگم مہناز رفیع ،ضیاء شاہد،ڈاکٹر رفیق احمد اور راجہ تجمل حسین نے بھی خطاب کیا اور کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔سٹیج سیکرٹری کے فرائض شاہد رشید نے انجام دیئے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ

میں نے اس کتاب میں ''اپنا گریباں چاک'' کر کے سب کے سامنے رکھ دیا ہے اپنے لئے کچھ نہیں رکھا کتاب لکھنے کے دوران مجھے بہت سی ان باتوں کا احساس نہیں تھا جن کا ذکر اس تقریب میں مختلف مقررین نے کیا ہے اس بھرپور تقریب میں اہل علم و دانش کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

''اپنا گریباں چاک'' پر روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ۲۸ مئی ۲۰۰۳ کی اشاعت میں قیوم نظامی کا ایک بھرپور تبصرہ بھی شائع ہوا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

''جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' ہر لحاظ سے ایک منفرد تصنیف ہے یہ آپ بیتی بھی ہے سفرنامہ بھی ہے، اس میں تاریخ، کلچر، فلسفہ، سیاست تعلیم، نظام انصاف سب کچھ موجود ہے اس کتاب کو پڑھ کر آپ گھر بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر سکتے ہیں جاوید اقبال ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کا موقع ملا اور بھرپور زندگی گزاری۔ میں نے اپنی زندگی میں اس قدر بے باک کتاب نہیں پڑھی۔ جاوید قبال کو گلہ ہے کہ وہ اپنے والد کے سایے سے باہر نہ نکل سکے اور اقبال کے نام سے ہی پہچانے گئے انہوں نے خود ہی تحریر کیا ہے کہ وہ ساتویں، نہم، ایم اے (انگریزی) اور قانون میں پہلی بار فیل ہوتے رہے جس سے ان کی اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے انہیں خدا اور اپنے عظیم والد کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ خوشحال اور شہرت سے بھرپور زندگی گزارنے میں کامیاب رہے اگر وہ فرزند اقبال نہ ہوتے تو گم نام زندگی ان کا مقدر ہوتی جاوید اقبال وکالت عدالت اور سیاست میں ممتاز مقام حاصل نہ کر سکتے۔ کتاب میں شامل چند دلچسپ مشاہدات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے برطانیہ تشریف لے گئے تو جاوید اقبال نے خط لکھ کر اپنے والد سے گراموفون لانے کا مطالبہ کیا علامہ اقبال نے اپنے بیٹے کے اس مطالبے پر ایک نظم لکھی جس میں

نصیحت کی

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر ؎

جاوید اپنی ہمشیرہ منیرہ سے لڑتے رہتے تھے ایک دن علامہ اقبال نے کہا:

''تمہارا دل پتھر کا ہے تم بڑے سنگ دل ہو، اتنا نہیں جانتے کہ بہن کے سوا تمہارا اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔''

علامہ اقبال بھوپال گئے اور اپنے دوست سید راس مسعود کے ہاں قیام کیا۔ ایک دن علامہ نے راست مسعود سے کہا مسعود تمہارا دماغ تو انگریز کا ہے مگر تمہارا دل مسلمان کا ہے۔ راس مسعود حاضر جواب تھے فوراً بول اٹھے اقبال خدا کا شکر کرو کہ میرا دماغ مسلمان کا اور دل انگریز کا نہیں علامہ اقبال کی وفات سے دو ماہ قبل پنڈت نہرو، میاں افتخار الدین کے ہمراہ علامہ کے گھر ملاقات کیلئے آئے علامہ بیمار تھے اور بستر پر لیٹے ہوئے تھے نہرو صوفے پر بیٹھنے کی بجائے فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔ مصنف نے اپنی کتاب میں ذوالفقار علی بھٹو کی قومی خدمات، جنگی قیدیوں کی رہائی اسلامی سربراہی کانفرنس اور ایٹمی ٹیکنالوجی کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ جاوید اقبال بتاتے ہیں کہ فاروق لغاری کو صدارت کے منصب سے ہٹانے کیلئے سینٹر کی حیثیت سے تحریک انہوں نے پیش کی تھی جس پر اراکین پارلیمنٹ نے دستخط کر دیے تھے۔ فاروق لغاری نے خطرے کو بھانپتے ہوئے صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ جاوید اقبال صفحہ ۲۶۶ پر تحریر کرتے ہیں کہ مجید نظامی کے اعزاز میں ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مجید نظامی کنزرویٹو ہیں جبکہ وہ خود لبرل ہیں مجید نظامی نے اپنی تقریر میں فرمایا نہ میں کنزرویٹو ہوں نہ جاوید اقبال لبرل ہیں البتہ یہ حقیقت ہے جاوید اقبال کو علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر بڑا غصہ ہے اور علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں ''اپنا گریباں چاک'' کے بغور مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جناب مجید نظامی کی جاوید اقبال کے بارے میں رائے بالکل درست تھی۔

جاوید اقبال نے کتاب کے آغاز میں ہی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا خصوصی شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے

کتاب کے مسودہ پر نظر ثانی کی اور مفید مشورے بھی دیے رفیع الدین ہاشمی ایم اے اردو میں میرے کلاس فیلو تھے وہ کلاس میں فرسٹ آئے میں حیران ہوں کہ وہ کتاب میں اردو زبان اور گرامر کی غلطیوں کی اصلاح کیوں نہ کر سکے جاوید اقبال صفحہ ۱۰۰ پر تحریر کرتے ہیں۔

''سڈنی یونیورسٹی میں میں نے ایک لیکچر پاکستان پر دیا''

اسی طرح صفحہ ۱۰۷ پر رقم طراز ہیں کہ :

''چند ماہ میں میں نیویارک کی زندگی سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔''

پوری کتاب میں میں سے بھری پڑی ہے۔ حالانکہ بڑی آسانی سے اس تکرار سے گریز کیا جا سکتا تھا۔ کتاب کے صفحہ ۲۸۲ پر قرآن کی آیت کو ہی تبدیل کر دیا ہے اور ''قل العفو'' کو ''کلوا العفو'' تحریر کیا ہے۔ پاکستان کے ایک ممتاز صحافی نے مجھے بتایا کہ جاوید اقبال نے اپنے قلمی مسودہ میں بھی یہ لفظ غلط تحریر کیا ہے اور یہ طباعت کی غلطی نہیں ہے علامہ نے اپنے ایک مشہور شعر میں بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

جاوید اقبال اردو اور عربی زبان پر بھی مہارت نہیں رکھتے انہیں منفرد مقام حاصل نہ کر سکنے کا گلہ نہیں ہونا چاہئے غالب نے کہا تھا۔

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

جاوید اقبال نے اپنی زندگی میں ہی تصویر بتاں کو اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے جن کا کوئی جواز نہ تھا۔ کتاب کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال کی روح ضرور بے چین اور بے قرار ہوئی ہو گی افسوس جاوید اقبال نے علامہ کے مداحوں اور عقیدت مندوں کے جذبات کا احساس بھی نہ کیا اور سرِ عام ''اپنا گریباں چاک'' کر کے اس مقام سے بھی

گر گئے جو انہیں عظیم باپ کی وجہ سے ملا تھا کتاب کی قیمت چھ سو روپے ہے جو متوسط طبقے کی قوت خرید سے باہر ہے کتاب میں اگر تصویروں کی بھر مار نہ ہوتی تو جلد بندی کے لئے موٹا گتہ استعمال نہ کیا جاتا اور موٹا ٹائپ استعمال نہ ہوتا تو کتاب تین سو روپے میں بھی شائع ہو سکتی تھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ پبلشر نے کتاب کو گریس فل بنانے کی کوشش کی ہے خامیوں کے باوجود یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔

دلچسپ اور مندرجات کے حوالے سے بقول انور سدید یہ کتاب ادبی حلقوں میں پڑھی جاتی رہے گی۔

فہم اقبال سے متعلق ادھورے استفسارات کے علاوہ ''اپنا گریباں چاک'' کئی اعتبار سے ایک دلچسپ سوانح عمری ہے۔ بظاہر جاوید اقبال بھرپور جسمانی اور مادی زندگی کا قدم قدم پر اظہار کرتے ہیں تاہم ان کی تحریر کے پس منظر میں بعض باتیں روحانیات سے بھی تعلق رکھتی ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر سلمان علی نے اپنے مقالے ''اردو کی منتخب سوانح عمریوں میں خرق عادات واقعات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ'' میں ''اپنا گریباں چاک'' پر بھی بحث کی ہے۔

ان کے خیالات کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

جسٹس ریٹائرڈ ڈاکٹر جاوید اقبال فرزند اقبال ہونے کے ناطے جو ہر ایک کے جانے پہچانے ہیں انہوں نے اپنی خودنوشت کے عنوان کے لئے اپنے والد مرحوم کے شعر کا ایک حصہ چنا ہے۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

''اپنا گریباں چاک'' دلچسپ واقعات اور سادہ اسلوب کی وجہ سے خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس خودنوشت میں ڈاکٹر صاحب نے کچھ واقعات ایسے بیان کئے ہیں۔ جو ارواح کے متعلق ہیں۔ ان تمام واقعات کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ ان واقعات کو بالترتیب نقل کیا جائے ملاحظہ کیجئے اس سلسلے میں پہلا واقعہ۔

''شہاب نے مجھے بتایا کہ جب مارشل لاء لگا تو سکندر مرزا کا مستقبل معلوم کرنے کی خاطر وہ اس خاتون کے پاس گئے اور اس سے سوال کیا کہ سکندر مرزا کا کیا بنے گا خاتون بے ہوشی کے عالم میں چلی گئیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے آنے والے واقعات ایک فلم کی طرح چلنے لگے وہ بولتی گئیں جیپ میں چند فوجی افسر بیٹھے ایوان صدر میں داخل ہوئے (وقفہ) ان میں ایک جرنیل ہے جس کے ماتھے پر سرخ رنگ کی لاٹ ہے (وقفہ) وہ ہال کے اندر کھڑا ہے (وقفہ) ایک معتبر شخص ڈریسنگ گاؤن پہنے سیڑھیوں سے اتر رہا ہے اس کی جیب میں پستول ہے (وقفہ) وہ آدمی اور ایک خاتون فوجی گاڑی میں سوار ہو کر رخصت ہو گئے'' شہاب نے ساری کہانی ایسے مؤثر انداز میں بیان کی کہ میری نگاہوں کے سامنے بھی فلم چل گئی۔''

دوسرا واقعہ ایک انگریز پادری کی روح کے حوالے سے ہے لکھتے ہیں کہ:

''والدہ مرحومہ کی چچیری بہنوں کی کوٹھیاں شملہ میں موجود تھیں اور ان کی دعوت پر میں ان کے ہاں جا کر ٹھہرتا کوٹھیوں میں سے ایک جس کا نام ہائیٹ ویل تھا۔ بھاری تھی۔ وہاں کسی زمانے میں ایک انگریز پادری کی رہائش تھی جو قتل کر دیا گیا تھا۔ بعض اوقات اتوار کی رات اس کی روح وہاں آیا کرتی اور گھر کے دروازے کھٹکنے لگتے اگر کوئی ایک دروازہ کھول دیا جاتا تو سکوت طاری ہو جاتا ایک رات میں اور عزیز نچلے بیڈ روم میں سوئے ہوئے تھے اور ان دنوں صرف ہم دو ہی گھر میں مقیم تھے اچانک برآمدے میں لکڑی کے فرش پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی چند لمحوں بعد دروازے پر کھٹکا ہوا جیسے کوئی لکڑی کی چھڑی سے اسے کھٹکھٹا رہا ہو۔ ہم دونوں جاگ اٹھے دروازے کے پیچھے تیز روشنی تھی۔ گویا کسی نے پہاڑی سڑک پر موٹر کار کھڑی کر کے بتیاں جلا دی ہوں حالانکہ وہاں کوئی موٹر کار نہیں آسکتی تھی۔ اس روشنی میں دروازے کے اندھے شیشوں

سے ہمیں ایک شبیہہ نظر آئی جو سیاہ گاؤن اور ہیٹ میں ملبوس تھی عزیز کا پلنگ دروازے کے قریب تھا اور وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہا ''یس یوؤر ہائنس کم ان کم ان پلیز آئی اوپن داڈور فار یوسر!'' اتنے میں اپنے رضائی سے نکل کر وہ دروازے کی طرف لپکا اور اسے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھول دیا پل بھر میں روشنی غائب ہوگئی۔ اور ہر طرف خامشی چھا گئی۔''

اس طرح کے دو واقعات اور بھی ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے :

''مجھے اپنی زندگی میں چند مشاہدات میں عالم ارواح کے وجود کا قائل کر دیا ہے۔ اس ضمن میں پہلا واقعہ تو بھٹو کو پھانسی دیے جانے کے متعلق ہے۔ ہم میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ بھٹو کو کب پھانسی دی جائے گی۔ مگر ماہ اپریل کے اوائل میں ایک شب میں اور ناصرہ سو رہے تھے کہ کوئی تین بجے کے قریب اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اوڑھی ہوئی چادر میرے اوپر سے کھینچ کر پرے پھینک دی ہے میں ہڑبڑا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ کھلے کالر اور کھلے کفوں کی قمیض اور شلوار پہنے بھٹو نہایت تلخ لہجے میں انگریزی میں بتا رہے ہیں کہ (لک وٹ دے ہیو ڈن ودمی)'' دیکھو انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ ناصرہ بھی جاگ اٹھیں کہنے لگیں کہ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے میں نے جواب دیا کہ (ابھی ابھی بھٹو یہاں موجود تھے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پھانسی دے دی گئی ہے۔)

''دوسرا واقعہ میرے پرانے دوست منور حسین بخاری کی موت کا ہے۔ اس رات ہمارا چھوٹا بیٹا ولید ہوائی جہاز پر نیویارک سے لاہور آ رہا تھا ناصرہ کسی کام سے اسلام آباد گئی ہوئی تھیں اور میں خوابگاہ میں اکیلا تھا رات کے کوئی دو بجے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں نے پہلی کھٹکھٹاہٹ تو شاید خواب میں سنی مگر

دوسری بار کھٹکھٹاہٹ کے وقت میں یقیناً جاگ رہا تھا میں اٹھ بیٹھا اور سمجھا کہ ممکن ہے کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہو۔ پردہ اٹھا کر باہر جھانکا مگر ہر طرف خاموشی اور رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی پھر جس دروازے پر کھٹکھٹاہٹ ہوئی تھی میں نے کھول کر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں ڈر گیا۔ اور طرح طرح کے وسوسوں نے مجھے آلیا یہی دعا کرتا رہا کہ خداوند تعالیٰ ولید کا نگہبان ہو اور وہ خیر و عافیت لاہور پہنچ جائے۔ اگلے روز صبح ہمارے بڑے بیٹے ولید نے مجھے فون پر بتایا کہ گزشتہ شب دو بجے میرے دوست منور حسین بخاری حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گئے اور چار بجے بعداز دوپہر ان کا جنازہ ہے۔ میرے مشاہدے سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ جب کسی کی روح اس جہاں سے پرواز کرتی ہے تو جاتے جاتے جسے چاہے اسے کسی غیر مادی یا مادی ذریعہ سے اپنی رخصت کی اطلاع دے دیتی ہے۔ مگر اس کے بعد وہ کہاں جاتی ہے؟ اس کے بارے میں قیاس یا ایمان کا سہارا ہی لیا جا سکتا ہے کیونکہ پھر اس سے ملاقات شاذ و نادر یا تو خوابوں میں ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔''

اسی نوعیت کا ایک اور منفرد واقعہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دوست موج کے حوالے سے بھی بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

''موج اپنی والدہ سے بے حد پیار کرتے تھے لندن میں قیام کے آخری سال ان کی والدہ شدید بیمار ہوئیں اور بیٹے کو آخری بار دیکھ سکنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ امتحانات کے سبب موج ان کا قرب حاصل کرنے کی خاطر واپس نہیں جا سکتے تھے اس لئے بے قراری اور پریشانی کے عالم میں اپنی استعمال شدہ قمیض جس میں ان کے پسینے کی خوشبو تھی ماں کو بھیج دی۔ ماں نے مرتے دم تک قمیض اپنے سینے سے لگا کر رکھی اور وفات پر ان کی خواہش کے مطابق وہ قمیض ان کے ساتھ ہی دفن کر دی گئی۔ واپس پہنچ کر موج کا

معمول تھا کہ وہ صبح منہ اندھیرے اٹھتے قبرستان جا کر ماں کی قبر پر حاضری دیتے اور پھر دفتر جا کر کام شروع کرتے۔ اسی طرح گرمیوں کی ایک تاریک رات زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ موج کی آنکھ کھلی تو گمان کیا کہ شاید صبح ہوگئی ہے تیار ہو کر بمطابق معمول قبرستان پہنچے ماں کی قبر کے قریب بقول ان کے والدہ مرحومہ کفن میں ملبوس ہاتھ پھیلائے کھڑی نظر آئیں موج ڈر گئے اور موسلا دھار بارش میں گرتے پڑتے قبرستان سے دفتر پہنچے۔ وہاں چوکیدار سے پتہ چلا کہ ابھی تو رات کے صرف دو بجے تھے۔ اور صبح کا کوئی نام ونشان تک نہ تھا۔ موج واپس گھر آ کر سو رہے اور دہشت کے سبب دن چڑھنے پر بھی دفتر نہ گئے بلکہ گجرانوالہ سے لاہور آ گئے معلوم ہوا کہ ان کے دوستوں نے مری جانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ آپ بھی تیار ہو گئے اگلے روز مری جاتے ہوئے ان کی کار حادثہ کا شکار ہوگئی باقی سب احباب اور ڈرائیور تو صحیح سلامت رہے صرف موج ہی کو شاید ان کی والدہ اپنے ساتھ لے گئیں۔''

اس طرح آگے جا کے ڈاکٹر صاحب جسٹس چودھری محمد صدیق کے حوالے سے بھی ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جسٹس چودھری محمد صدیق داڑھی رکھنے سے پیشتر پکے رند تھے مگر بعد میں نہ صرف تائب ہو گئے بلکہ فیصل آباد کے پیر برکت علی مرحوم کے زیر اثر انہوں نے صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ تصوف کی منازل بھی طے کرنا شروع کر دیں ایک دن مجھ سے کہنے لگے تصور کی دنیا میں حضرت علامہ اقبال کے مزار پر دعا کے لئے جاتے اور پھر داتا داتا دربار حاضری دے کر واپس فیصل آباد کے ضلع میں اپنے چک پہنچتے ایک روز میں جرأت کر کے ان سے پوچھ بیٹھا کہ پیر و مرشد داتا صاحب کے دربار میں حاضری دینا تو بجا مگر آپ کا علامہ اقبال کے مزار پر جانا جو ایک پیر و مرشد نے اپنا ہاتھ میرے

منہ پر رکھ کر کہا آگے مت کچھ کہنا میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ان کا مقام کیا ہے۔''

''کہنے لگے کہ ایک دن میں بمطابقِ معمول لاہور میں تھا حضرت علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دے کر داتا دربار پہنچا وہاں مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد واپس فیصل آباد جانے کے لئے اپنی جیپ میں بیٹھنے لگا تو کسی نے مجھے روکا اور کہا کہ داتا صاحب یاد کر رہے ہیں۔ میں جیپ سے اتر کر اس شخص کے پیچھے پیچھے چپ چاپ غلام گردش سے گزرتا داتا صاحب کی تربت تک پہنچا۔ اس شخص نے تربت پر پڑے بہت سے غلافوں میں سے ایک نکال کر مجھے تھما دیا اور کہا کہ لے جاؤ یہ داتا صاحب کی طرف سے ہے۔ فیصل آباد جاتے ہوئے جیپ میں بیٹھے بار بار یہی احساس ہوتا تھا کہ شاید میری موت قریب آن پہنچی ہے اور داتا صاحب نے میری قبر کے لئے اپنا غلاف عطا کیا ہے بہر حال فیصل آباد پہنچ کر کچھ دیر ستانے کے لئے بس اپنی بیٹھک میں اترا تو معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کا دیرینہ خدمتگار علی بخش فوت ہو گیا ہے۔ میں اپنے چک واپس پہنچنے سے پہلے علی بخش کی قبر پر ان کے چک میں گیا اس کے جنازے میں شریک ہوا اور جب اسے دفنا چکے تو وہ غلاف میں نے علی بخش کی قبر پر اوڑھا دیا سو چودھری صاحب! علامہ اقبال کے مرتبہ کے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں بس اس سے اندازہ کر لو کہ ان کے خدمت گار کی تربت کے لئے داتا صاحب نے اپنا غلاف اتروا کر میرے ہاتھ بھجوایا۔''

غور کیا جائے تو یہ واقعات اپنی تحیر خیزی اور ڈرامائیت کی وجہ سے نہ صرف مطالعے کی دعوت دیتے ہیں بلکہ یہی واقعات ڈاکٹر صاحب کے مخصوص اور دلچسپ اسلوب کی تشکیل میں مدد و معاون بھی ثابت ہوتے ہیں:

''جاوید اقبال نے عطیہ بیگم کے جن ماورائی واقعات کا ذکر کیا ہے تو یہ خاتون دراصل قدرت اللہ شہاب کی دریافت تھیں جو سیکرٹریٹ کے کسی سپرنٹنڈنٹ کی بیوی تھیں اور

خود طاری کردہ بے ہوشی کے عالم میں بتا سکتی تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔عطیہ بیگم کے ان عجیب وغریب واقعات کے حوالے سے ممتاز مفتی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری الکھ نگری میں بڑے شدومد سے بیان کیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماضی جوگزرا ہے حال جو ہر انسان کا اپنا ہے اور مستقبل جو آنے والا ہے اس کے بارے میں کیسے اس طرح کی پیش گوئیاں کی جاتی ہیں۔عام طور پر تو یہی دیکھا جاتا ہے کہ ہر واقعہ دوسرے واقعے کا ردعمل ہوتا ہے۔واقعات کی کڑیاں اور پورا سلسلہ ابھی وقوع پذیر ہوا ہی نہیں اور اچھا برا انجام پہلے سے بتا دیا جائے بڑی تحیر انگیز بات ہے جیسے مراقبے سے مذکورہ واقعات کا ذکر ہوا ہے عجیب بات یہ ہے کہ شہاب کی اپنی رائے جو مفتی نے بیان کی ہے اس سلسلے میں بڑی عجیب ہے ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دن رسالہ پریڈکشن پڑھ رہا تھا کہ قدرت آ گیا کہنے لگا میں بھی کالج میں پریڈکشن پڑھا کرتا تھا بڑی مزے کی چیز ہے لیکن پھر میں نے اسے چھوڑ دیا۔۔۔خیال آیا کہ اگر ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے اور Finality rests with God اس کے بعد پیش گوئی بے معنی ہو جاتی ہے۔اور کشف میں نے پوچھا وہ بھی تو پیش گوئی ہے اس نے جواب دیا اور اگر کوئی بزرگ کشف کی بات کرے تو چاہے کوئی بھی مستقبل کی بات کرے اگر فائنلیٹی اللہ کے ہاتھ میں ہے پر ایمان رکھتے ہیں۔تو آپ کو پیش گوئی پر حتمی یقین نہیں آئے گا چاہے وہ سچی ثابت ہو جائے پھر بھی ہمیں اس پر حتمی یقین نہیں کرنا چاہئے۔''

اگر شہاب کا یقین اور ایمان واقعی اللہ پر تھا تو پھر انہیں آخر کیا پڑی تھی کہ لوگوں کو عطیہ کے بارے میں بتاتے رہتے، بلکہ عطیہ کی کرامات کی تشہیر کرتے رہے اور لوگوں کو وہاں لے جاتے بھی رہے،جس کا ذکر جاوید اقبال نے کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

''شہاب کی شخصیت کا ایک پہلو جو میرے لئے نہایت عجیب وغریب تھا وہ روحانیات یا سو پرنیچرل پر ان کا اعتماد تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک خاتون کا ذکر کیا جو مرکزی سیکرٹریٹ کے کسی سپرنٹنڈنٹ کی بیوی تھیں۔ اس خاتون کے ہاں خفیہ طور پر سکندر مرزا بھی جایا کرتے تھے۔ شہاب نے ساری کہانی ایسے موثر انداز میں بیان کی کہ میری نگاہوں کے سامنے بھی فلم چل گئی شہاب نے مجھ سے کہا کہ اگر میں بھی اپنے مستقبل کے متعلق اس خاتون سے کچھ معلوم کرنا چاہوں تو ہم ابھی اس کے ہاں جاسکتے ہیں، سو شہاب مجھے ان کے گھر لے گئے۔ وہ ایک عام سی خاتون تھیں۔ معمولی سے سرکاری فلیٹ میں رہتی تھیں چونکہ کوئی سوال کرنے کو نہ تھا سو اس لئے تھوڑا عرصہ بیٹھ کر ہم وہاں سے چلے آئے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف بقول مفتی شہاب صاحب Finality rests with God پر یقین رکھتے تھے اور دوسری طرف عطیہ کی پیش گوئیوں کا پرچار بھی کرتے رہے اب اسے قدرت اللہ کا تضاد کہا جائے یا ان تمام باتوں کو مفتی جی کی بے پر کی اڑانے پر محمول کیا جائے غرض جو بھی ہو مگر اس پورے ڈرامے میں واقعات شواہد یہ بتاتے ہیں کہ عطیہ درحقیقت شہاب ہی کا ایک دوسرا کردار ہے جو موصوفہ کے costume میں رہ کر ہی بہتر طریقے سے کھیلا جاسکتا ہے۔ جہاں تک جاوید اقبال نے اپنی آپ بیتی میں عطیہ کا ذکر کیا ہے تو اس واقعے کے چشم دیدہ گواہ تو جاوید اقبال نہیں مگر انہوں نے شہاب کی زبانی یہ واقعہ سنا ہے اس طرح کے روحانیات پر مبنی اور مافوق الفطرت واقعات شہاب کے حوالے سے نہ صرف منسوب ہیں بلکہ اس کے لئے وہ اچھے خاصے مشہور بھی ہیں۔ اس واقعے سے جو اہم سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا کوئی شخص خود طاری کردہ بے ہوشی کے عالم میں یہ بتا سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے؟

انسان از خود انکشاف حقیقت نہیں کرسکتا۔ حقیقت اپنے آپ کو خود انسان پر منکشف Reveal کرتی ہے لیکن یہ انکشاف حقیقت (وحی) ہر انسان پر نہیں ہوتا یہ انکشاف خاص خاص انسانوں پر ہوتا ہے۔ جنہیں نبی یا رسول کہا جاتا ہے وہ انسان اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ہیں حضرت محمد ﷺ وہ آخری انسان تھے جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملی اس کے بعد وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ اس لئے علم کے جو ذرائع ہمارے

پاس ہیں ایک تو ان میں قرآن جو خدا کی آخری کتاب ہے اور جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے، دوسرا انسانی عقل اس کے علاوہ کشف، الہام، باطنیت اور پیشگی واقعات کی خبر دینا وغیرہ۔ سب اسلام کی حقیقی روح کے منافی ہیں۔ مظہر الدین صدیقی اسلامی تحریک اور اس کا پیدا کردہ "ذہن" کے عنوان پر لکھتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہہ گئے ہیں:

> "اسلامی فکر فلاطونی فلسفہ اور نو فلاطونیت کی کامل تردید تھی۔ سب سے پہلے اسلام نے ثنویت کا ابطال کر کے زندگی کے عمل اور فکر کی وحدت کا اثبات کیا۔ اس نے علم ظاہر اور علم باطن میں کوئی تفریق نہیں کی اور نہ کسی فوق الحس عالم کا تخیل پیش کیا۔ وہ احساسات و مدرکات کو عقل کے منافی نہیں قرار دیتا ہے اور نہ عقل کو وجدان کی ضد ٹھہراتا ہے قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ کشف و الہام کے ذریعے حقائق اشیاء کی جستجو کرو البتہ تفکر اور تدبر کی بار بار ہدایت کی گئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ کشفی اور الہامی علم لازماً "معتبر نہیں ہوتا"۔

ان تمام باتوں کی حقیقت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا مگر اسے کشفی الہامی اور مافوق الفطرت ہستیوں اور واقعات کے راویوں کی کمی بھی ہمارے معاشرے میں نہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان لوگوں کے کچھ خاص مقاصد ہوتے ہیں جو عوام و خواص کی کم علمی اور ضعیف الاعتقادی کے راستے پورے ہوتے ہیں۔ جیسے مذکورہ واقعے ہی میں جاوید اقبال نے دبے لفظوں کچھ سوالات کے ابھارنے سے نہ صرف حقیقت کی نشاندہی کی ہے بلکہ بعض پردہ نشینوں کو بے نقاب بھی کیا ہے۔

میرے لئے یہ بات بڑے اچنبھے کا باعث تھی کہ شہاب نے اس خاتون کو کیسے دریافت کیا سکندر مرزا کیوں اس خاتون سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھنے آتے تھے۔ اور اب شاید جنرل ایوب خان بھی ان کے ہاں شہاب کے ساتھ جاتے ہوں۔"

غور کیا جائے تو مذکورہ اقتباس کا آخری سوال نہ صرف سوال ہے بلکہ اس پورے ڈرامے اور اس کے

مرکزی کردار کا کلائمکس بھی ہے جس سے واقعات کی حقیقت کھلنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔

جہاں تک دوسرے واقعے کا تعلق ہے جس میں جاوید اقبال نے ایک کوٹھی کا ذکر کیا ہے تو بات تو ان کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی کہ یہاں نہ صرف ایک انگریز پادری قتل کیا گیا ہے بلکہ اس کی روح بھی یہاں آتی ہے۔اس واقعے کا خوف ظاہری بات ہے کہ ان کے ذہن کو گھیرے ہوئے تھا جس کا ذکر تو موصوف نے نہیں کیا مگر اس واقعے کا وقوع پذیر ہونا ہی دراصل ان کے لاشعور میں چھپے خوف پر دلالت کرتا ہے۔

دوسری بات جس کا مصنف نے باقاعدہ ذکر بھی کیا ہے کہ ایک رات میں اور عزیز نچلے بیڈ روم میں سوئے ہوئے تھے ان ہی دنوں ہم دو ہی گھر میں مقیم تھے۔

> ''ان دونوں کو اپنے اکیلے پن کا احساس درحقیقت ان کے لاشعور میں چھپے خوف کے لئے جہاں مہمیز کا کام کرتا ہے تو وہاں نیند سے فوری بیداری کے لمحات جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں۔ نیند سے فوری اٹھنے کے بعد ذہن اور حواس کچھ لمحوں کے لئے اتنے محرک اور فعّال نہیں ہوتے۔مگر رفتہ رفتہ انسان کے حواس اور ذہن قوا حاصل کرتے رہتے ہیں جب تک انسان کا ذہن اور وجود اپنے صحیح مقام پر نہیں آجاتا تب تک یہ ''نیم مردہ حواس'' ذہن کو ایسی الٹی سیدھی اطلاعات پہنچاتے رہتے ہیں جن کی بناء پر ذہن اطراف و جوانب اور مظاہرے کے بارے میں گمراہ کن نتائج اور انتشار و خلفشار کی طرف لے جاتا ہے بالکل اسی طرح ان دونوں کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا جس خوف اور احساس تنہائی میں یہ دونوں سو چکے تو نیند سے بیداری کے بعد جو بھی روشنی نظر آئی جس کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے سوائے مصنف کی سوچ کے اسی روشنی میں ان کے لاشعور میں پہلے سے چھپے خوف نے نہ صرف انگریز پادری کو متشکل کر کے انہیں دکھایا بلکہ عزیز نے تو باقاعدہ ڈر اور خوف کی حالت میں بھی بجائے اپنی زبان میں بات کرنے کے انگریزی میں پادری کی روح سے بات کی جس سے یہ بات سامنے آتی

ہے کہ ان کے لاشعور میں پادری کے قتل کے حوالے سے پوری داستان اور اس کے
ساتھ ڈر اور خوف اپنی پوری جزئیات سمیت پہلے سے موجود تھا اب اگر مصنف اور
عزیز اپنے لاشعوری خوف کو پادری کی روح نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔''

علاوہ ازیں جاوید اقبال نے دو واقعات براہ راست اپنے حوالے سے بھی نقل کئے ہیں میں ان کے بقول مجھے اپنی زندگی میں ان واقعات نے عالم ارواح کا قائل کر دیا ہے پہلا واقعہ ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے سے ہے اور دوسرا منور حسین بخاری کے بارے میں جن کی روحوں نے جاتے جاتے انہیں اپنے جانے کی اطلاع دی۔

''بھٹو کی ذہانت قابلیت اور انقلابی شخصت کا اندازہ ''اپنا گریباں چاک'' کے صفحات
پر بکھرا پڑا ہے جس میں ایک طرف مصنف بھٹو کی قابلیتوں کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری
طرف بھٹو کے ساتھ معاملات میں ایک حریف کی شکل میں بھی سامنے آتے ہیں۔
جہاں موصوف بھٹو کے مقابلے میں باقاعدہ الیکشن لڑتے ہیں جس میں انہیں ناکامی کا
سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔''

ظاہری بات ہے کہ انسان اپنے دوستوں اور حریفوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے موخرالذکر کے بارے میں انسان کا تخیل اور بھی متحرک ہوتا ہے۔ اور جب حریف ہی ایسا نابغہء روزگار ہو کہ جس کی گواہی خود مصنف نے اپنی آپ بیتی میں جگہ جگہ دی ہو ملاحظہ کیجئے اس کی کچھ مثالیں:

''بھٹو کرپٹ بالکل نہ تھے تماش بینی بھی اپنے سرمایہ دار یا جاگیردار دوستوں کے خرچ
پر کرتے تھے۔ مگر اجتماعی طور پر ملک وقوم کے لئے ان کی خدمات فراموش نہیں کی
جاسکتیں۔ انہوں نے ہزاروں پاکستانی جنگی قیدیوں کو بھارت کے چنگل سے چھٹکارا
دلایا۔ حالانکہ بعض اصحاب کے نزدیک وہ قید بھی بھٹو کی وجہ سے ہوئے تھے کیونکہ بھٹو
ہی نے ملک کو دولخت کرایا تھا۔ شملہ معاہدے میں کشمیر کاز کو زیادہ نقصان نہیں پہنچنے دیا
اگر بھارت نے ۱۹۷۲ء میں ایٹم بم چلایا تو بھٹو نے اس عزم کا اظہار برملا کیا کہ گھاس

کھالیں گے، لیکن پاکستان کو نیوکلیئر پاور ضرور بنائیں گے اور بالآخر انہی کے لگائے ہوئے پودے نے پھل دیا اور پاکستان ۱۹۸۸ء میں نیوکلیئر پاور بن گیا۔ اسی طرح او آئی سی کو فعال بنانے کی غرض سے انہوں نے مسلم ممالک کے سربراہان کا سربراہی اجلاس ۱۹۷۴ء میں لاہور میں منعقد کرایا وہ اپنے عہد میں نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ تیسری دنیا کے واحد اہم تر قائد کی صورت میں ابھرے۔''

اس طرح بھٹو کی ذہانت کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ:

''واشنگٹن پہنچنے پر پاکستانی سفارت خانے اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نمائندوں نے میرا استقبال کیا۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے جو ارباب بست و کشاد جنوبی ایشیاء کے معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے سفیر صاحب کے ساتھ مجھے لنچ پر مدعو کیا۔ اس لنچ پر امریکی افسروں نے ہمارے سفیر سلطان محمد خان کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ کیپیٹل ہل میں سلطان محمد خان کی مقبولیت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ نہ صرف وہ امریکہ کے آدمی ہیں بلکہ مجھے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ بھٹو حکومت نے اگر امریکہ سے فائدہ اٹھانا ہے تو سفیر کے عہدے کے لئے صرف وہی موزوں ہوں گے۔ لاہور پہنچ کر میں نے سفر کی رپورٹ بھٹو کو بھیج دی گرمیوں کا موسم تھا بھٹو مری میں تھے مجھے وہیں بلا بھیجا ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ سلطان محمد خان دو وجوہ کی بنا پر تمہیں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں لے کر گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ تم آ کر بتاؤ کہ کیپیٹل ہل میں وہ کس قدر مقبول ہے اور دوسری یہ کہ تم کس حد تک امریکہ کے کام آ سکتے ہو۔ بھٹو نے شاید شعیب یا امریکہ کو چڑانے کی خاطر میکسیکو میں پاکستانی سفارت خانہ قائم کرنے کے لئے انور آفریدی کو وہاں پہلے پاکستانی سفیر کے طور پر بھیجا تھا۔''

ان تمام واقعات سے جہاں بھٹو کی ذہانت اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کی لا ابالی شخصیت اور

سیاسی میدان میں فلمی ہیرو کی طرح مسلسل آگے بڑھتے رہنے۔ جیسی خصوصیات بھلا کسے اپنی طرف متوجہ نہیں کرے گی اور جاوید اقبال تو بطور خاص ان کو سوچتے ہوں گے۔ کیونکہ سیاسی میدان میں یہ دونوں ایک دوسرے کے نہ صرف حریف بلکہ قریب بھی رہے یہی وجہ ہے کہ بھٹو پر قتل کا مقدمہ دائر کرنے کے بعد جب انہیں گرفتار کیا گیا تو اس سلسلے میں مصنف کی سوچ ملاحظہ کیجئے:

> ''بھٹو کے لئے آسمانوں میں جو تانا بانا بنا جا رہا تھا وہ مکمل ہو گیا۔ خوش الحان چڑیا اب جال میں پھنس چکی تھی اور اسکی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے جج صاحبان چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کی سرکردگی میں بیٹھ چکے تھے۔ جہاں تک مولوی مشتاق حسین کا تعلق ہے وہ تو کیس سننے سے پیشتر ہی اپنا مافی الضمیر بتانے سے گریز نہ کرتے تھے۔ ایک دوپہر مجھے اور پروفیسر حفیظ ملک کو پنجاب کلب میں لنچ کھلا رہے تھے فرمایا یہ تو اوپن اور شٹ کیس ہے کھولو اور بند کر دو، لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہیں مولوی مشتاق حسین نے مجھے بھی اس بینچ پر بیٹھنے کو کہا لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں بھٹو کے مقابلے میں الیکشن ہار چکا ہوں۔ اب ان کی زندگی یا موت کا فیصلہ کرنے والی بینچ پر بیٹھنا میرے دل کو گوارا نہیں۔''

ان تمام اقتباسات کو ذہن میں رکھنے کے بعد یہ اندازلگانا مشکل نہیں کہ بھٹو کی ابھرتی ہوئی دلکش لاابالی و سیاسی شخصیت مصنف کے شعور و لاشعور کا حصہ بن چکی تھی۔ اور ظاہری بات ہے کہ ایسی شخص کو جس انجام سے دوچار ہونا تھا اس کو بھلا مصنف کو پتہ نہ ہوگا کہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ خصوصا آخری اقتباس تو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں بھٹو کو پھانسی پر چڑھنا ہے۔ بے شک مصنف اس کا اقرار تو نہ کرے ہم میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ بھٹو کو کب پھانسی دی جائے گی مگر اس اقرار کے لئے ان کا لاشعور ہی کافی ہے جس نے باقاعدہ بھٹو کی روح بن کر انہیں انگریزی میں بتایا:

''Look What they have done to me''

عجیب بات یہ ہے کہ اس طرح کے روحانی واقعات عموماً سوتے یا تاریکی میں زیادہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ انسان ہوش وحواس میں ہو اور بھرے ہجوم میں تو پھر نہ روحیں آتی ہیں اور نہ جنات و پریاں جہاں تک منور حسین بخاری کی موت کا تعلق ہے تو وہ بھی اگر غور کیا جائے تو مصنف نے یہی کہا ہے کہ ناصرہ کسی کام سے اسلام آباد گئی ہوئی تھی اور میں خوابگاہ میں اکیلا تھا یہاں پھر روح کو موقع مل گیا۔

یہ کائنات اتنی وسیع اور بڑی ہے کہ ہر لمحہ کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے نئی نئی دنیائیں بن رہی ہیں کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر ایڈن ہبل (Edin P. Hubble) کی تحقیق ملاحظہ کیجئے:

> ''۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر ہبل نے جو رپورٹ پیش کی اس میں انہوں نے ایسے ۲۴ کہکشاؤں کا حوالہ دیا جن کا انہوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ ۱۹۳۶ء تک انہوں نے اس سے چار گنا تعداد میں کہکشاؤں کے متعلق مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ انہوں نے ان مشاہدات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر ۳۳،۰۰۰،۰۰۰ نوری سال کے فاصلے پر کائنات کے پھیلنے کی رفتار میں ۵۲۶ کلومیٹر فی سیکنڑ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہبل نے یہ نتیجہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی دوربین کے ذریعے ۱۰۲ کہکشاؤں کے مطالعے کے ذریعے اخذ کیا۔ جس کا قطر سوا نچ تھا۔ کائنات کی اسی مسلسل وسعت کی طرف اقبال نے بھی اشارہ کیا ہے۔
>
> یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
> کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں''

کائناتی سطح پر جب ہر لمحہ اس طرح کے تغیرات وقوع پذیر ہو رہے ہوں تو اسی طرح پر دہ زمین پر بھی کہیں خوشی کہیں غم وغیرہ جیسے واقعات ہوتے رہتے ہیں اس لئے ہر واقعے کو دوسرے کا ردِ عمل نہیں سمجھنا چاہئے خاص کر اس طرح کے اتفاقات جب سامنے آتے ہیں۔ تو ضعیف الاعتقادی اسے نئے نئے رنگوں میں پیش کرتی رہتی ہے جس کی وجہ سے گھبراہٹ اور خوف در آتا ہے شاید اسی گھبراہٹ اور خوف پر قابو پانے کے لئے غالب بھی اپنے مخصوص اسلوب میں تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

رات دن گردش میں ہے سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

دوسری بات یہ کہ اس طرح کے واقعات کو بیان کرنے میں نہ صرف رنگینی سے کام لیا جاتا ہے بلکہ انہیں بڑھا چڑھ کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ انسان بسیط حقائق کے مقابلے میں محیر العقول عجائبات کو زیادہ تیزی سے اپنی طرف کھینچتے ہیں اس سلسلے میں مصنف کی اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

''میری اپنی ڈرامہ نویسی میں نیچرل عنصر کے ساتھ سوپر نیچرل عنصر (روحانی نہ سہی) کا بڑا عمل دخل تھا۔ میرے نزدیک انسانی زندگی حرکت کے عمل میں نیچرل اور سوپر نیچرل دونوں عناصر سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ڈرامے کے کرداروں میں جب تک سوپر نیچرل عنصر کی پراسراریت شامل نہ کی جائے تو بات نہیں بنتی۔''

بات تو مصنف نے اپنی ڈرامہ نویسی کے حوالے سے کی ہے۔ مگر وہ حقیقی زندگی میں سوپر نیچرل کی اہمیت کے بھی معترف نظر آتے ہیں اور ڈرامے کے لئے تو موصوف اسے ضروری بھی خیال کرتے ہیں۔

مصنف کی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے جب ان کی خودنوشت میں سوپر نیچرل واقعات کا تحقیقی نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہاں بھی مصنف نے نیچرل کے ساتھ سوپر نیچرل کی پراسراریت شامل کی ہے بھلے سے حقیقت کچھ اور ہی کیوں نہ ہو۔!!!

اسی طرح کا سپر نیچرل واقعہ جو جاوید اقبال نے اپنے کلاس فیلو موج کی عجیب و غریب موت کے حوالے سے بیان کیا ہے تو وہ دراصل موج کا اپنی والدہ سے بہت زیادہ عقیدت اور پیار کی وجہ سے سامنے آتا ہے۔ موج لندن میں اپنی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے اپنی والدہ کی بیماری میں تیمارداری اور ان کے قرب سے محروم رہے۔

غور کیا جائے تو موج کی والدہ کے مرجانے کے بعد موج کے ہاں احساس ندامت اور شرمندگی کے جذبات ان کی ماں کے لئے محبت میں اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موج باقاعدہ اپنی والدہ کی قبر پر آفس جانے سے پہلے حاضری دیتا تھا۔ اس کا یہ عمل جہاں ان کے احساس ندامت میں اضافہ کرتا تو اس کے ساتھ ماں

کے لئے محبت اور ہمدردی کا جذبہ بھی مزید پروان چڑھتا۔ندامت اور پچھتاوے کی آگ میں جلتے جلتے جب ایک دن ان کی آنکھ جو بظاہر کھلتی ہے اور جو واقعہ پیش آتا ہے وہ دراصل موج پر نیم خوابیدگی کی حالت میں آتا ہے۔

جس میں یہ قبرستان جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ شعور کی حالت میں نہیں ہوتا بلکہ یہ سارا کیا کرایا ان کے لاشعور کا ہے کیونکہ موج اس کیفیت سے دوچار تھے کہ ان کے لاشعور نے شعور پر گرفت حاصل کر لی تھی۔

والدہ کو کفن میں ملبوس ہاتھ پھیلائے دیکھنا' درحقیقت ماں کی حسرت اور موج کا اس سلسلے میں ناکام رہنا ظاہر کرتا ہے یہ سب کچھ حقیقت میں نہیں بلکہ ان کے لاشعور میں چھپے احساس ندامت نے ان کو دکھایا اور پھر گرتے پڑتے آفس پہنچنے کے بعد جب ان پر یہ عقدہ کھلتا ہے، کہ ابھی تو صبح کا نام ونشان بھی نہیں تو یہ واقعات درحقیقت ان کے لئے دہشت اور خوف کا سبب بنتے ہیں دوسری بات یہ کہ مردہ لوگوں کو اس طرح اپنی آنکھوں سے دیکھنا جو کہ حقیقت اس کے برعکس ہے تحیر کے ساتھ ڈر اور خوف کو بھی جنم دیتا ہے۔

جہاں تک موج کی موت کا تعلق ہے تو یہ اسی واقعے کے اندر ایک دوسرا واقعہ ہے یہ تمام واقعات چونکہ ایک ترتیب سے رونما ہوتے ہیں اس لئے عام نظر تو ایک واقعے کو دوسرے کا ردعمل سمجھ کر ہی قائل ہو جاتی ہے مگر تحقیقی چھان پھٹک کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ موج کی موت سراسر ایک الگ واقعہ ہے جو ڈرائیور کی غفلت کی وجہ سے سامنے آتا ہے۔

زندوں میں تو اتنی صلاحیت نہیں کہ حیات وممات کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھ سکیں تو مردے بھلا دوسروں کی جان کیسے لے سکتے ہیں۔؟

جہاں تک جاوید اقبال نے جسٹس چودھری محمد صدیق کے حوالے سے ان کے راہ سلوک کے تجربات کا ذکر کیا ہے۔تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تصوف کی دنیا کے باسی جب اس راہ پر چل نکلتے ہیں تو پھر انہیں ہر آہٹ پر الہام اور ہر عمل پر غیب کے اشاروں کا گمان ہوتا ہے اور اس طرح انسان اپنے تمام اعمال کے ڈانڈے ان دیکھی دنیاؤں ور مافوق الفطرت ہستیوں سے جوڑتا ہے زندوں کی دنیا میں مردوں کی حکمرانی اور عقل وخرد کی جگہ مدہوشی وخود فراموشی کی کارفرمائی بڑھ جاتی ہے گویا ''مردہ بدست زندہ'' کا محاورہ تصور کی نرالی دنیا میں ''زندہ بدست مردہ'' بن جاتا ہے۔

اس طرح کے واقعات قرآن سے دوری کے سبب رونما ہوتے ہیں بھلے سے انسان جسٹس چودھری محمد صدیق ہی کیوں نہ ہو جہاں تک اقبال کی بات ہے تو انہوں نے اسلامی فکر پر چھائے ہوئے عجمی تصورات کو نمایاں کر دینے کی کوشش میں نہ صرف اپنی پوری زندگی صرف کی بلکہ ملت اسلامیہ کو مجموعی حیثیت سے قرآن کا بھولا ہوا سبق بھی یاد دلایا۔

علامہ اقبال کے نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے نہ صرف پیر پرستی کو خودی کے لئے سم قاتل قرار دیا ہے بلکہ روایت تصوف کو بھی خودی کے پنپنے اور قرآن فہمی کی راہ میں ایک رکاوٹ گردانتے ہیں ملاحظہ کیجئے ان کا ایک خط جو انہوں نے سلمان ندوی کو ۱۹۱۷ میں لکھا۔

''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوفِ وجودیہ سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے
جس نے عجمیوں کی دماغی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔''

عجیب بات یہ ہے کہ اقبال نے پوری زندگی جن چیزوں کی تکذیب کی اور انہیں جھٹلایا انہی نظریات کے ماننے والوں نے اقبال کو بام پر چڑھایا اقبال کا اپنے بارے میں یہ کہنا بالکل بجا ہے۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد مردوں کا عمل دخل اگر زندوں کی دنیا میں برقرار رہے تو پھر ان کے مرنے کی وجوہ کیا ہو سکتی ہے۔؟ قرآن تو اس سلسلے میں واضح اعلان کرتا ہے۔

''اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے اور اگر وہ تمہاری پکار سن بھی لیتے تو وہ
اس کا جواب نہ دے سکتے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''انہیں تو اپنے متعلق بھی اتنا شعور نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے''

قرآن کے ان واضح ارشادات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا رابطہ اس

مادی جہاں اور یہاں کے معاملات سے نہ صرف کٹ جاتا ہے بلکہ انہیں اپنی ذات کا شعور تک نہیں رہتا چہ جائیکہ دوسروں کی زندگی اور موت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔

پتہ نہیں کہ اس بندے نے کیا سوچ کر داتا صاحب کے مزار کا غلاف موصوف کو دیا۔؟

علی بخش کی موت کا پیشگی علم انہیں کیسے حاصل ہوا؟

غور کیا جائے تو داتا صاحب کے دربار کا غلاف دینا ایک علامتی فعل ہے جس کے بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں جن میں مالی فوائد کا حصول یا موصوف کی ضعیف الاعتقادی کو آڑ بنا کر کوئی دوسرا پھنسا ہوا کام نکلوانا وغیرہ غرض یہ غلاف جس مقصد کے لئے بھی دیا گیا ہو مگر یہ بات قطعی ہے کہ یہ علی بخش کے لئے نہیں تھا اور اگر ہم اس کو علی بخش ہی کے لئے فرض کریں تو پھر قرآنی احکامات جن کا حوالہ دیا جا چکا ہے کی صریح خلاف ورزی ہوگی۔

علی بخش کی موت ایک الگ واقعہ ہے جس کو موصوف کی ضعیف الاعتقادی نے خود بخود ایک پلاٹ کی شکل میں پرونے کی ناکام سعی کی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ غلاف علی بخش کے لئے نہیں تھا اس لئے موصوف اگر اس غلاف کو علی بخش ہی کے لئے سمجھتے ہیں تو یقیناً غلاف دینے والے کی امید پر پانی پھیرا ہوگا۔

☆☆☆

(ج)

اسلوب:

''اپنا گریباں چاک'' کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ اس کا دلچسپ اسلوب ہے۔''اپنا گریباں چاک''میں جاوید اقبال نے اکثر مقامات پر فلسفیانہ انداز اپنایا ہے۔جاوید کا فلسفہ ہے کہ اپنی انا پر اعتماد کرنے والا انسان بدی کا راستہ اختیار کر کے اس سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔جاوید کے نزدیک ایسا شخص بے وقوف ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو یا بدی کا راستہ اختیار نہ کیا ہو یا جو فرشتہ صفت ہو۔انسان بدی اور گناہ کی دلدل سے قوت ارادی کے زور ہی سے نکل سکتا ہے۔لیکن جاوید کی رائے میں یہ خصوصیت مستقل طور پر صرف پیغمبروں یا اولیاء اللہ کو ہی نصیب ہوئی ہے اور انسان کے لیے ایسا ممکن نہیں ہے۔انسان کی تمام زندگی نیکی اور بدی کے راستوں پر سفر میں گزر جاتی ہے۔

انہیں ہمیشہ سے اپنے انوکھے طرز فکر کا احساس رہا ہے۔ندرت اور انفرادیت کا یہ احساس جاوید اقبال کی تحریروں میں نمایاں ہے۔۱۹۴۶ء میں جاوید اقبال ایم اے انگریزی میں فیل ہو گئے۔اپنی اس ناکامی کا سبب وہ ادب کے بارے میں اپنے انوکھے نکتۂ نظر کو قرار دیتے ہیں جو ہو سکتا ہے کہ ممتحن کو پسند نہ آیا ہو۔چودھری محمد حسین نے جاوید سے کہا کہ حصول علم کے دوران میں تکبر کی بجائے عاجزی سے کام لینا چاہیے۔اس کے بعد جاوید نے ایم اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا پھر بغیر کسی تیاری کے ایم اے انگریزی کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئے۔بعد ازاں ان کی تمام تر توجہ فلسفہ کی طرف مبذول ہو گئی۔

معلومات کی فراہمی ان کے اسلوب کا ایک نمایاں پہلو ہے۔''اپنا گریبان چاک''میں مختلف ممالک کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے حوالے سے بھی معلومات موجود ہیں مثلاً جاوید اقبال اپنے چین کے سفر کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ چین سے انہیں بہت سے تحفوں اور سوغاتوں کے ساتھ رخصت کیا گیا بعض اشیا خود خریدی گئیں۔چین کے بونے درخت آرٹ کا عمدہ نمونہ ہیں۔ان درختوں کے پودوں کو اوائل عمر ہی میں اس طرح کاٹا جاتا ہے کہ بڑے

سیب کا بڑا درخت بھی چھوٹا ہو کر چند انچوں کے سائز کا رہ جاتا ہے۔ اگر اس کی احتیاط نہ کی جائے تو یہ مرجاتا ہے۔ اگر اسے باہر زمین میں گاڑ دیا جائے تو یہ رفتہ رفتہ پورے سائز کا درخت بن جاتا ہے بونے درخت چین میں مہنگے داموں بکتے ہیں۔ دوسو برس پرانے بونے درخت ملک سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں۔

''اپنا گریباں چاک'' میں اکثر مقامات پر اسلوب نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ بعض مقامات پر جاوید اقبال کی نثر میں نظم کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ نثر کی اعلیٰ ترین صورت ہے اگرچہ ایسے مقامات بہت زیادہ نہیں لیکن جہاں جہاں یہ انداز نظر آیا ہے کتاب میں قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہُوا ہے۔

جاوید اقبال نے اپنے بیرونی اسفار کی داستان میں مختلف مقامات پر غیر محسوس انداز میں ان ممالک کی تہذیب اور معاشرت کے نمونے محفوظ کر لیے ہیں۔ جس کے باعث ان کی اس آپ بیتی میں مشاہداتی انداز نمایاں ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر میکسیکو میں آم کھانے کے طریقے۔ آم کھانے کے لیے استعمال ہونے والی چھری اور کرچ کا بیان' آم کاٹنے کا انداز وغیرہ۔ اسی طرح میکسیکن لوگوں کے کھانے میں چاول' سالن اور روٹی کی اہمیت اور مرچ کا زیادہ استعمال یہ سب ایسی معلومات ہیں جو ہمیں جاوید اقبال کی اس آپ بیتی میں چلتے چلتے نظر آجاتی ہیں۔ ایسی معلومات کے ذیل میں جاوید اقبال کی جزئیات نگاری قابلِ ستائش ہے۔ درج ذیل اقتباس دیکھیے:

> ''پہلی چیز جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا' وہ میکسیکو میں آم کھانے کا طریقہ تھا۔۔۔۔۔ امراء کے طبقہ میں اس مقصد کے لیے علیحدہ قسم کی چھری' کرچ یا تلوار نما کانٹا اور چھوٹا سا چمچہ استعمال کیا جاتا ہے۔ نوکیلی کرچ نما چاندی کی تلوار پلیٹ پر رکھے آم کی گٹھلی میں اس طرح گھونپ دی جاتی ہے جیسے بل فائٹر کی تلوار بیل کے سر میں گھونپی جاتی ہے۔ پھر الٹے ہاتھ سے آم کو سیدھا تھام کر چاندی کی چھری سے آم کی کاشیں کاٹ لی جاتی ہیں۔ بعد میں چاندی کے چمچہ کے ساتھ آم کا گودا چھلکے سے نکال کر کھایا جاتا ہے اور آخر میں تلوار میں پھنسی گٹھلی کو منہ کے قریب لے جا کر اس کا گودا بھی دونوں طرف سے نوش کر لیا جاتا ہے۔ یوں نہ تو ہاتھ آم کے رس سے لت

پت ہوتے ہیں اور نہ منہ۔''(۱)

قیوم نظامی بیرونی اسفار کی داستان کے متعلق لکھتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

''جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' ہر لحاظ سے ایک منفرد تصنیف ہے یہ آپ بیتی بھی ہے سفرنامہ بھی ہے اس میں تاریخ، کلچر، فلسفہ، سیاست، تعلیم، نظام، انصاف، سب کچھ موجود ہے اس کتاب کو پڑھ کر آپ گھر بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر سکتے ہیں جاوید اقبال ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کا موقع ملا اور بھرپور زندگی گزاری میں نے اپنی زندگی میں اس قدر بے باک کتاب نہیں پڑھی۔''(۲)

جاوید اقبال صاحب طرز نثر نگار ہیں وہ اگرچہ ''اپنا گریباں چاک'' سے پہلے بھی چار پانچ دہائیوں سے نثر لکھ رہے ہیں، افسانے، ڈرامے، ترجمے، سماجی و سیاسی، تہذیبی و ثقافتی تحریریں جن میں تخلیقی نثر کے بھی بہت سے نمونے موجود ہیں۔ ''اپنا گریباں چاک'' جداگانہ اسلوب کا نمونہ سامنے لے کر آئی ہے اس اسلوب کے کئی عناصر ہیں جو نثر کی خوبیوں کے حامل ہیں اس اسلوب میں معلومات ہیں۔ روانی ہے سلاست اور بہاؤ ہے نثر کا ایک عالمانہ انداز ہے یہ اسلوب شاعری کے اعلیٰ ذوق کا مظہر ہے جس میں شعری قرینے کے ساتھ ساتھ برمحل شعر برتے گئے ہیں۔ اس اسلوب میں عربی فارسی کے الفاظ کے ساتھ انگریزی کے الفاظ بھی اپنے فطری انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔

''زندہ رود'' علامہ اقبال کی سوانح عمری کے ساتھ اگرچہ ان کے متعدد عالمانہ مقالات اور مضامین دہائیوں سے چھپ رہے ہیں مگر ''اپنا گریباں چاک'' میں جاوید اقبال کا اسلوب نثر ایک جداگانہ انداز کے ساتھ نمودار ہوا ہے۔ اپنے بارے میں بات کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے جاوید اقبال نے آپ بیتی کے اس رنگ میں واقعات کی جمع آوری اور معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اپنے بیان میں دلچسپی کے عنصر کو بھی برقرار رکھا ہے۔ یہی ان کے اسلوب نثر کی خوبی ہے کہ اس میں Readibility ہے یہ آپ بیتی اپنی دلچسپی کے حوالے سے قابل مطالعہ ہے۔

اس کے اسلوب کی ایک خوبی اس کی حقیقت پسندی بھی ہے جس کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر انور محمود خالد نے لکھا ہے کہ

''اپنا گریباں چاک'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے اپنی سرگزشت حیات سناتے وقت کہیں بھی لاف زنی، دروغ گوئی، خبطِ عظمت، کی نمائش اور اخفا سے کام نہیں لیا۔ ہمارے راہبر وراہِ محبت (جاوید اقبال) کے راستے میں بھی دو چار نہیں، کئی سخت مقامات آئے۔ لیکن ان پر آفرین ہے کہ اظہار صداقت میں ان کے قدم کہیں نہیں لڑکھڑائے اور وہ ایک باوقار، صاف گو اور مضبوط اعصاب کے مالک انسان کی طرح ان مراحل کو مردانہ وار طے کر گئے۔(۳)

قصہ مختصر علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال کی یہ سوانح عمری اپنے داخلی حالات و واقعات کے بیان میں ایک دلچسپ اسلوب کے حوالے سے ہمیشہ دلچسپی سے پڑھی جاتی رہے گی۔

مقالہ کے آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ کہیں کہیں اختلافی مسائل اور نرگسیت کے علاوہ ''اپنا گریباں چاک'' اردو کی سوانح عمریوں میں دلچسپ اسلوب کے حوالے سے ایک اہم سوانح عمری ہے عصر حاضر میں لکھی گئی سوانح عمریوں خصوصاً سرگزشت (زیڈ اے بخاری) یا عہدِ رفتہ (عبارت بریلوی) خواب باقی ہیں (آل احمد سرور) اس آباد خرابے میں (اختر الایمان) کھوئے ہوؤں کی جستجو (شہرت بخاری) گئے دنوں کا سراغ (مظفر وارثی) جو رہی سو بے خبری رہی (ادا جعفری) بری عورت کی کتھا (کشور ناہید) جہانِ دانش (احسان دانش) یادوں کی بارات (جوش ملیح آبادی) میں ''اپنا گریباں چاک'' (جاوید اقبال) ایک خوبصورت اور دلچسپ اضافہ ہے اپنے مخصوص اسلوب (جس میں علامہ اقبال سے بحیثیت فرزند اور ان کے نام اور حوالہ سے ملنے والی شہرت سے گریز پائی کی کوشش اور دوسرے مباحث جن میں فہم اقبال کے حوالے سے جاوید اقبال نے جدید ذہنی اور نسل کے شکوک و شبہات بھی آمیز کیا ہے) یہ کتاب ادبی حلقوں خصوصاً اقبال دوستوں میں ہمیشہ دلچسپی سے پڑھی جاتی رہے گی۔

''اپنا گریباں چاک'' کا مقام و مرتبہ اس کے مندرجات کی اہمیت اور اسلوب کی دل آویزی کے سبب

ہمیشہ وقیع رہے گا۔آپ بیتی کے توانا لہجے میں قدرت اللہ شہزاد کے اس قول پر ہم مقالے کا اختتام کرتے ہیں:

''ڈاکٹر جاوید اقبال کی آپ بیتی کا بنیادی وصف غیر جانبدارانہ وموّرخانہ انداز تحریر ہے وہ آنکھوں دیکھے واقعات میں معروضیت کو اوّلیت دیتے ہیں کہیں بھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے جس کے باعث ان کی خودنوشت قومی تاریخ کی ترتیب وتدوین میں اہم اور معتبر ذریعہ قرار دی جاسکتی ہے۔''(۴)

☆☆☆

حوالہ جات

(الف)

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۰۴ء) ص ۸

۲۔ ایضاً ص ۱۱

۳۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۸ مئی ۲۰۰۳ء

۴۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳۱ جنوری ۲۰۰۳ء

۵۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' مشفق خواجہ کا خط انور محمود خالد کے نام مشمولہ معاصر (انٹرنیشنل) عطاء الحق قاسمی، (مدیر)، (لاہور مارچ ۲۰۰۵ء) ص ۵۵۱

۶۔ ایضاً، ص ۵۵۲ تا ۵۵۶

۷۔ ایضاً، ص ۵۵۴

۸۔ ایضاً، ص ۵۵۶

۹۔ ایضاً، ص ۵۵۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۵۸

۱۱۔ قدرت اللہ شہزاد ''آپ بیتی کے توانا لہجے'' (لاہور مکتبہ جدید ۲۰۰۴ء) ص ۱۷

۱۲۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' جاوید اقبال کا خط انور محمود خالد کے نام مشمولہ معاصر (انٹرنیشنل) عطاء الحق قاسمی، (مدیر)، (لاہور مارچ ۲۰۰۵ء) ص ۵۴۶

۱۳۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۰۴ء) ص ۱۷۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۷۳

(ب)

۱۔ ان کاؤنٹرود ڈیسٹنی ٹرانسلیشن آف ''اپنا گریباں چاک'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس،۲۰۰٦ء)

۲۔ ان کاؤنٹرود ڈیسٹنی ٹرانسلیشن آف ''اپنا گریباں چاک'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس،۲۰۰٦ء)

۳۔ سید سلمان علی، ڈاکٹر، پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان ''اردو میں منتخب سوانح عمریوں میں خرق عادات واقعات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ'' (قرطبہ یونیورسٹی پشاور ۲۰۰۷ء)

۴۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۰ جنوری ۲۰۰۳ء

۵۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۸ مئی ۲۰۰۳ء

٦۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳۱ جنوری ۲۰۰۳ء

۷۔ سہ ماہی ''معاصر'' انٹرنیشنل لاہور اپریل ۲۰۰۴ء

(ج)

۱۔ روزنامہ نوائے وقت ۳۱ جنوری ۲۰۰۳ء

۲۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۰۴ء) ص ۱۱۳

۳۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، ''اپنا گریباں چاک'' مشمولہ سہ ماہی ''معاصر'' انٹرنیشنل (انٹرنیشنل)، عطاء الحق قاسمی (مدیر)، (لاہور مارچ ۲۰۰۵ء) ص ۵۴۸، ۵۴۹

۴۔ قدرت اللہ شہزاد، ''آپ بیتی کے توانا لہجے'' (لاہور: مکتبہ جدید ۲۰۰۴ء) ص ۷٦

☆☆☆

کتابیات

(ا) تصانیفِ اقبال

محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۲ء)

کلیات اقبال (اُردو) (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۹۵ء)

☆ مکاتیبِ اقبال

محمد اقبال، مکاتیب اقبال بنام گرامی، (مرتب)، محمد عبداللہ قریشی، (کراچی: اقبال اکادمی، ۱۹۴۹ء)

☆ تراجم/ترتیب وتدوین

محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، طبع سوم (مرتب)، سید نذیر نیازی (لاہور: بزمِ اقبال ۱۹۸۶ء)

انوارِ اقبال (مرتب)، بشیر احمد ڈار، (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء)

شذراتِ فکرِ اقبال، (مترجم)، (لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۷۳ء)

مقالاتِ اقبال، طبع دوم (مرتب)، عبدالواحد معینی، سید، (لاہور: آئینہ ادب ۱۹۸۲ء)

(ب) تصانیفِ جاوید اقبال

جاوید اقبال ڈاکٹر، میراثِ قائداعظم، (لاہور: فیروز سنز، دسمبر ۱۹۶۷ء)

مئے لالہ فام (اشاعت دوم)، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۳ء)

زندہ رود (تشکیلی دور)، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۳ء)

زندہ رود (وسطی دور)، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۱ء)

زندہ رود (اختتامی دور)، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۴ء)

اپنا گریباں چاک، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)

جہان جاوید (ڈرامے، افسانے، مقالے)، (لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۴ء)

خطبات اقبال (تسہیل وتفہیم)، (لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء)

(ج) کتب حوالہ :

قرآنِ حکیم، مترجم مولانا اشرف علی تھانوی، (اختصار شدہ از بیان القرآن)، (لاہور: پاک پبلشنگ کمپنی)

احتشام حسین سید، تنقیدی جائزے، (لکھنو: احباب پبلشرز ۱۹۵۶ء) ص ۱۴۶، ۱۴۷

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، (کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۹۹ء)

تاثیر، ڈاکٹر فضل حق قریشی (مرتب) اقبال کا فکر و فن، (لاہور: منیب پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء)

جابر علی سیّد، پروفیسر، اقبال کا فنی ارتقا، (لاہور: بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۷۸ء)

حنیف فوق، ڈاکٹر، مثبت قدریں، (ڈھاکا: دبستان مشرق، ۱۹۶۸ء)

حنیف ملک و ناصرہ اقبال، انکاؤنٹرز وِد ڈیسٹنی (اے ٹرانسلیشن آف "اپنا گریباں چاک" ۲۰۰۶ء)

خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکرِ اقبال، (لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۸۸ء)

رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، کتابیات اقبال، طبع اول، (لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۷۷ء)

تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، طبع اول، (لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان ۱۹۸۶ء)

اقبال اور میر حجاز، (لاہور: بزمِ اقبال جنوری ۱۹۹۴ء)

رئیس احمد جعفری، سید، اقبال اور عشقِ رسولؐ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۶ء)

اقبال اپنے آئینہ میں، (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۶ء)

سعشہ خان، ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال شخصیت اور ادبی خدمات، (لاہور: سورج پبلشنگ بیورو ۱۹۹۵ء)

سلیم اختر، ڈاکٹر، پروفیسر، اقبالیات کے نقوش، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷)

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۵ء)

شاہ علی سید ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری، (کراچی: گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء)، ص ۱۳

صابر کلوروی (مرتب)، اقبال کے ہم نشین، طبع اول، (لاہور: مکتبہ خلیل، ۱۹۸۵ء)

صدیق جاوید، ڈاکٹر، اقبال نئی تفہیم (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۳ء)

عبداللہ ڈاکٹر سید، مسائلِ اقبال، (لاہور: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۴ء)

ولی سے اقبال تک، بار دوم (لاہور: منصور پریس، ۱۹۶۳ء)

محمد عبداللہ قریشی، معاصرین۔ اقبال کی نظر میں (لاہور: مجلسِ ترقی اَدب، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۳ تا ۲۵

عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل، (لاہور: گلوب پبلیشرز)، س۔ن

(ر) رسائل وجرائد:

اقبال، مدیر وحید قریشی، ڈاکٹر، بزمِ اقبال، لاہور جلد ۳۵ شمارہ ۲ جولائی ۱۹۸۸ء

اقبالیات اقبال نمبر، مدیر محمد منور، پروفیسر، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء)

نیرنگِ خیال، ماہنامہ، راولپنڈی، فروری مارچ ۱۹۵۲ء

نوائے وقت، روزنامہ (لاہور ۱۰ جنوری ۲۰۰۳) نوائے وقت، روزنامہ (لاہور ۳۱ جنوری ۲۰۰۳ء)

نوائے وقت، روزنامہ (لاہور ۲۸ مئی ۲۰۰۳ء)

سہ ماہی ''معاصر'' انٹرنیشنل (لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء)

صحیفہ، لاہور، مئی جون ۱۹۷۹ء

فنون، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء

ایضاً، لاہور، جلد ۲۱، شمارہ ۴، ۵، مئی جون ۱۹۸۵ء

دائرے، کراچی، مئی جون ۱۹۸۵ء

انٹرویو

ڈاکٹر جاوید اقبال سے

بتاریخ: ۱۰ ستمبر ۲۰۰۸

بمقام: رہائش گاہ ڈاکٹر جاوید اقبال گلبرگ لاہور

ضمیمہ

(الف) خطوط

مکتوب جاوید اقبال بنام ڈاکٹر انور محمود خالد

تبصرہ ڈاکٹر انور محمود خالد بحوالہ ''اپنا گریباں چاک''، مشفق خواجہ

مکتوب مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر انور محمود خالد بحوالہ ''اپنا گریباں چاک''

انٹرویو

ڈاکٹر جاوید اقبال سے

بتاریخ: ۱۰ ستمبر ۲۰۰۸

بمقام: رہائش گاہ ڈاکٹر جاوید اقبال گلبرگ لاہور

''اپنا گریباں چاک''

مشفق خواجہ کا خط انور محمود کے نام

ڈاکٹر انور محمود خالد

۳ڈی۔۲۶/۹

ناظم آباد۔کراچی ۷۴۶۰۰

۱۰ مارچ ۲۰۰۴ء

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون

یہ جان کے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ریڈیو سے اردو آپ بیتیوں پر ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا ہے۔ آپ نے اردو انگریزی کی بے شمار آپ بیتیاں دیکھی ہیں اور اس موضوع پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ جب یہ سلسلہ تقاریر مکمل ہوگا تو آپ اس کی نظر ثانی کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ نظر ثانی کی بات اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ریڈیو کی کچھ محدودات ہوتی ہیں، اس وجہ سے موضوع کے ساتھ اس طرح انصاف نہیں کیا جا سکتا جس طرح کسی علمی و ادبی جریدے کے لیے مضمون لکھتے وقت سارے پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بحث کی جاتی ہے۔

آپ نے ''اپنا گریباں چاک'' پر اپنی تقریر کی جو نقل بھیجی ہے، میں اسے پڑھ کر محظوظ ہوا۔ آپ نے ریڈیو کی محدودات کا بھی خیال رکھا ہے اور موضوع کا حق ادا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تاہم اس شذرے کو تنقیدی مقالات کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کتاب کے بہت سے پہلو ایسے ہیں کہ اگر آپ ان پر بحث کرتے تو قاری کو کتاب کے عیوب و محاسن کے سمجھنے میں آسانی ہوتی۔

مجھے اس کتاب کے چھپنے کی اطلاع (شائع ہونے کی نہیں) ڈاکٹر داؤد رہبر سے ملی تھی۔ اعجاز بٹالوی کے پاس اس کا ایک قبل از اشاعت نسخہ تھا جو انہیں مصنف نے اس خیال سے دیا تھا کہ وہ اس پر ایک نظر ڈال کر اطمینان

کرلیں اس میں کوئی بات قابل اعتراض تو نہیں۔ وہ امریکہ گئے تو کتاب ساتھ لے گئے اور واپس آتے وقت ڈاکٹر داؤد رہبر کو پیش کر دی۔ جب ڈاکٹر رہبر نے اس کے طبع ہونے کا ذکر کیا تو چاہا فوراً اس سے استفادہ کروں۔ لاہور ایک دوست کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ چھپنے کی حد تک بات درست ہے البتہ اشاعت میں کچھ وقت لگے گا کیوں کہ تصویروں کے انتخاب کا مسئلہ قدرے پیچیدہ ہو گیا ہے۔ میں بڑی بے تابی سے انتظار کرتا رہا۔ جب یہ شائع ہوئی تو میں نے اسے بلا تاخیر حاصل کیا۔ آپ ہی کی طرح مجھے بھی آپ بیتیوں سے دلچسپی ہے، اور پھر یہ تو علامہ اقبال کے فرزند کی آپ بیتی تھی، اس لیے میں نے اسے بڑے اشتیاق سے پڑھا۔

بلا شبہ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے، اپنے مواد اور اسلوب تحریر دونوں اعتبار سے۔ اس کا بنیادی وصف Readability ہے۔ کتاب پہلے ہی صفحہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور جوں جوں کتاب آگے بڑھتی ہے، یہ گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ میں نے یہ خوبی بہت کم کتابوں میں پائی ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی ایسی بھی ہے، جو اردو زبان کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ یہ کتاب صرف لفظوں ہی میں نہیں لکھی گئی، تصویروں میں بھی بیان کی گئی ہے۔ مصنف نے جتنا کچھ لفظوں میں کہا ہے، اس سے کہیں زیادہ تصویروں میں بیان کر دیا ہے۔ خصوصاً ان بے نام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

افسوس صد افسوس پچھلے ہفتے ان کا انتقال ہو گیا۔ کیسا نفیس انسان ہم میں سے اٹھ گیا۔ مجھے ان سے نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔ کراچی آتے اور اگر وقت ہوتا تو کسی ہوٹل میں ملاقات کے لیے وقت نکالتے۔ اکثر یہ ملاقات حمید نسیم مرحوم کے ساتھ ہوتی۔ ایک دو مرتبہ مشتاق احمد یوسفی صاحب بھی شریک محفل ہوئے۔ میں لاہور جاتا تو ان سے ملاقات کی کوشش کرتا۔ آخری ملاقات اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر کے دولت خانے پر ہوئی جہاں ڈاکٹر صاحب نے بہت سے کرم فرماؤں کو جمع کر رکھا تھا۔ اعجاز صاحب بیماری کے باوجود اس محفل میں موجود تھے۔ کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے۔

چہروں کی زبانی جو انگلستان میں مصنف کے سلسلہ روز و شب کے رفیق تھے۔ (یہاں آپ لفظ ''روز'' کو غیر ضروری قرار دے کر خذف کر سکتے ہیں)۔

کتاب کا ایک نمایاں وصف مصنف کی بے باکی ہے۔ ''بے باکی'' کے ساتھ ایک اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے ''حق گوئی''۔ میں تو یہ نہیں کہوں گا کہ کتاب حق گوئی و بے باکی کا عمدہ نمونہ ہے کیوں کہ آپ بیتی میں حق کا منبع لکھنے والے کی ذات ہوتا ہے، اس لیے حق بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ لکھنے والا پیش کرتا ہے۔ لیکن بے باکی یہ ہے کہ لکھنے والا ایسی باتیں بھی لکھ دے جو کوئی دوسرا کہنے کی جرات نہ کر سکے۔ جرات کی یہ کمی عموماً اپنے آپ کو پارسا بنا کر پیش کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے یا پھر لکھنے والا معاشرتی و اخلاقی دباؤ کے تحت جرات اظہار سے محروم ہو جاتا ہے۔ ''اپنا گریباں چاک'' ایک بے باک بلکہ بہادر انسان کی آپ بیتی ہے جو اپنے بارے میں ہر بات کہنے کی جرات رکھتا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''کیمبرج کے ڈیرڈیول'' لڑکوں نے بھی صحیح طور پر کیمبرج میں کا اسٹیٹس کوالی فائی کرنے کے لیے چند قوائد بنا رکھے تھے۔ مثلاً پراکٹر اور اس کے تیز رفتار بل ڈاگز کے ہاتھوں سے بچ نکلنا، رات کے دو بجے کالج کے اندر بغیر پکڑے گئے پوری رات گزارنے میں کامیاب ہونا۔ اپنے پانچ سالہ کیمبرج کے قیام میں میں ان میں سے دو قواعد کوالی فائی کرنے میں کامیاب رہا۔ وہ کون سے دو قواعد تھے؟ یہ ایک پہیلی ہے جسے کوئی بوجھے تو جانیں''۔ (ص ۷۶)

دیکھیے کتنے خوب صورت پیرائے میں مصنف نے بتا دیا ہے کہ وہ لڑکیوں کے کالج میں بغیر گرفت میں آئے پوری پوری راتیں گزارتے رہے ہیں۔ موصوف نے ''کیمبرج مین'' کا اسٹیٹس کوالی فائی کرنے کے لیے جو تین قاعدے ہی ہیں جنہیں کوالی فائی کرنے میں وہ کامیاب رہے۔

لکھتے ہیں:

> ''والد کی وفات کے بعد میں ان کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہو گیا۔ جن باتوں سے انہوں نے منع کر رکھا تھا میں نے بڑی رغبت سے ان میں سے ہر ایک کو اپنایا۔ صحیح و غلط

میں غلط اور نیکی و بدی میں بدی کا رستہ منتخب کرنا بہتر سمجھا۔ اگر شام گھر میں موجود رہنے کا حکم تھا تو میں آدھی رات سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھتا اگر سنیما دیکھنا منع تھا تو میں ہر روز دو دو بلکہ تین تین شو دیکھتا۔ روزمرہ کے باورچی خانے کے حساب میں گھپلا کرتا۔ رنگ برنگی ریشمی قمیصیں، مہنگے ولائتی بوٹ اور یورپی انداز کے سلے ہوئے سوٹ، نکٹائیاں، اوور کوٹ، دستانے اور فلیٹ ہیٹ زیب تن کرتا۔۔۔۔۔ اس زمانے میں مال روڈ پر کرپارام اچھی قمیص سینے میں مشہور تھا۔۔۔۔۔ مال روڈ پر ہی لاہور کے مشہور ریسٹورنٹ واقع تھے ۔ اسٹینڈرڈ، اسٹیفلر، میٹروفلیٹیز، نیڈوز وغیرہ بھی مے نوشی، یورپی طرز کے رقص و سرور رات کے کھانے کے لیے معروف جگہیں تھیں''۔ (ص ۴۷۔۴۶)۔

یہ اس جاوید کا حال ہے جس کے لیے اقبال نے یہ دعا کی تھی:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

علامہ اقبال کی دعا قبول ہوئی مگر صرف کپڑوں کی حد تک۔ عزیز موصوف نے کیسے کیسے بے داغ لباس زیب تن کیے! انہیں جاوید اقبال کو علامہ نے نصیحت بھی کی تھی۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

جاوید اقبال نے اس نصیحت پر لفظاً و معناً عمل کیا۔ پہلے یہیں لاہور میں اور پھر انگلستان جا کر۔ علامہ لفظ ''عشق'' کو جن وسیع اور بلند معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ جاوید اقبال کو ان سے سروکار نہیں تھا، ان کے ہاں یہ لفظ ان معنوں میں مستعمل رہا جن معنوں میں حالی کے اس شعر میں آیا ہے:

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا، اس کو بٹھا کے چھوڑا

علامہ نے انہیں یہ نصیحت بھی کی تھی:

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

غزل سے مے لالہ فام پیدا کرنا خاصا پیچیدہ اور مشکل کام تھا جسے مال روڈ لاہور کے ہوٹلوں نے خاصا آسان کر دکھایا۔

ان جملہ ہائے معترضہ کے لیے معذرت خواہوں۔ وہاں تو بات ہو رہی تھی والد کی وفات کے بعد فرزند ارجمند کی آزادروی کی۔ لاہور میں پھر انگلستان میں بھی انہیں حسنِ بازار سے لے کر حسنِ بزم خاص تک سے محفوظ ہونے کے مواقع ملے اور بالآخر ہر طرح کے بازاروں سے گزرنے کے بعد یہ نظریہ قائم کیا:

''ایسا شخص جس نے گناہ کیا ہو یا بدی کا راستہ اختیار نہ کیا ہو یا جو فرشتہ سیرت ہو عموماً بے وقوت ہوتا ہے''۔ (ص ۵۰)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی دانش مندی یا دانش وری بے بنیاد نہیں ہے۔ اسی دانش مندی نے اس زمانے میں بھی جب وہ انصاف کی کرسی پر اور ہاتھوں میں انصاف کا ترازو لئے ہوئے بیٹھے تھے، ان کو اس قسم کے نظریات پر ثابت قدم رکھا:

''جنرل ضیاء الحق کے دور میں پی سی او کے تحت ۔۔۔۔۔ جن جج صاحبان نے اصولاً حلف نہ اٹھایا وہ بھی اپنی جگہ درست تھے اور جنہوں نے آمر کے حکم پر حلف اٹھالیا، وہ بھی غلط نہ تھے''۔ (ص ۲۱۶)

اسی کو کہتے ہیں: رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے بے باکی یعنی جرات کے اظہار کے سلسلے میں ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو انگریزی تمدن میں گم ہو جانے (ص ۴۷) ہم جنس پرست لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان گھومنے (ص ۸۰) اور ساری ساری رات رقص کرنے (ص ۸۲) سے متعلق ہیں۔ بے باکی کی انتہا وہاں نظر آتی ہے جہاں وہ حسینوں کا

ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کی تائید میں والدِ محترم کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:

لڑکیاں جو کیمبرج میں میری واقف بنیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق مصوری، مجسمہ سازی یا ساز سنگیت ہی سے تھا۔ ان میں بعض تو بے حد خوبصورت تھیں، گویا ہاتھ لگانے سے ان کے میلے ہو جانے کا امکان تھا ۔مگر بقول علامہ اقبال:

چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روے
تپد آں زماں دلِ من، پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ، زستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

علامہ اقبال نے جو بات ایک وسیع تناظر میں کہی تھی، جاوید اقبال نے اسے ''نگار بازی'' تک محدود کر کے ''ریش بابا'' سے بھی کھیلنے کی جسارت کی ہے اور یہ کہ پہلے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی اپنے مزاج و مذاق کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ فرماتے ہیں ''میری نگاہ جب کسی ماہ جبین کے حسن پر پڑتی ہے تو اسی لمحے میرا دل اس سے بھی خوب تر کسی حسینہ کے لیے دیوانہ وار خواہش کرنے لگتا ہے''۔ (ص ۸۳، ۸۴)۔۔ اگر علامہ اقبال کو معلوم ہوتا کہ ان کے خوب سے خوب تر کی تلاش کے فلسفے کو محض ہوس پرستی سمجھا جائے گا اور سمجھنے والے بھی ان کے فرزند ارجمند ہوں گے تو وہ شاید شاعری ترک کر دیتے۔

مینڈک کی ٹانگیں (ص ۱۲۳) اور بعد ازاں سالم مینڈک کھانے والے (ص ۱۲۹) کی بے باکی کا ایک ثبوت اس وقت بھی ملتا ہے جب وہ بڑے خوب صورت پیرائے میں امریکی جمہوریت پر طنز کرتے ہیں:

''۔۔۔۔ ایک خاتون لفٹ میں داخل ہوئیں جنہوں نے نہایت بیش قیمت فرکوٹ (پوستین) زیب تن کر رکھا تھا۔ فرکوٹ شاید اتفاقاً دیدہ دانستہ طور پر سامنے سے سرک گیا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھیں۔ صرف جوتے پہن رکھے تھے۔ میرے دل سے فوراً نکلا :اصل جمہوریت تو امریکہ ہی میں ہے''۔ (ص ۱۲۱)

اسی بے باکی کا نتیجہ ہے کہ کتاب میں کئی جگہ ڈاکٹر صاحب نے اظہار افسوس کیا ہے کہ انہیں فرزند اقبال یعنی میوزیم پیس سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

''بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں منایا کیوں کہ مجھے علم ہی نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ جوان ہوا تو تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا یہ میرے لیے پدرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔ زندگی میں اچھا برا مقام پیدا کیا، تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو مجھے بہت برا لگا۔ یہ میری انا کی نشو ونما میں مداخلت تھی۔ اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے، میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔ ''ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا''۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے علامہ اقبال کے حوالے سے میوزیم پیس کی طرح پاکستان کے اکثر حکمران بیرونی مہمان شخصیات سے متعارف کراتے رہے ہیں''۔ (ص ۱۹۳)

ایک مرتبہ مجید نظامی نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی موجودگی میں ایک جلسے میں یہ کہا کہ:

''یہ حقیقت ہے کہ جاوید اقبال کو علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر بڑا غصہ ہے۔ نیز وہ علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں''۔ (ص ۲۶۶)

اس الزام کا جواب دیتے ہوئے جاوید اقبال فرماتے ہیں:

''مجھے علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے یا ان کا فرزند ہونے پر غصہ نہیں، البتہ علامہ اقبال کے ان پرستاروں پر غصہ ضرور آتا ہے جو ان کے افکار کی نفی کرتے ہوئے مجھے صرف فرزند اقبال کی حیثیت سے جاننا چاہتے ہیں، اور اس فریم سے میرا باہر نکلنا انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ میں جب کبھی ملک سے باہر لیکچروں کے لیے بلوایا جاتا ہوں تو میری شناخت جاوید اقبال کے طور پر ہوتی ہے۔ مگر میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک کے اندر میری حیثیت فرزند اقبال کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جب ۱۹۷۷ء میں وفاقی

حکومت نے ہمارے گھر جاوید منزل کو اقبال میوزیم بنانے کی خاطر خرید لیا تو میرے
دو معصوم بچوں نے مجھ سے سوال کیا کہ ابو، اب ہمارا کیا بنے گا۔ میں نے انہیں کہا تم دونوں
کو علیحدہ علیحدہ بوتلوں میں بند کر کے یہاں سجا دیا جائے گا۔ کہنے لگے اور آپ کہاں
جائیں گے میں نے جواب دیا میں تو پہلے ہی بوتل میں بند ہوں۔'' (ص ۲۶۶)

گستاخی معاف، جاوید اقبال کی شناخت ملک میں اور بیرون ملک یکساں ہے۔ یعنی وہ فرزند اقبال ہی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور انہیں زندگی میں جو کچھ ملا وہ مالی آسودگی ہو یا عہدے، وہ اعزازی ڈگریاں ہوں یا غیر ملکی اسفار کے پے در پے موقع، یہ ان کی ذاتی کوشش کا نہیں، فرزند اقبال ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، لیکن یہ ڈگریاں ہزاروں نہیں، لاکھوں افراد حاصل کرتے ہیں لیکن ان کو وہ مرتبہ وہ حیثیت اور مقام نہیں ملتا جو جاوید اقبال کو ملا۔ جاوید اقبال نے علم و ادب کی دنیا میں یا کسی دوسرے فن کے حوالے سے کوئی ایسا کارنامہ بھی انجام نہیں دیا جو بے مثال ہو تو پھر اپنی الگ پہچان اور الگ شناخت پر اصرار کیوں؟

ڈاکٹر صاحب کے علمی و ادبی جو کام کی حد تک اہمیت رکھتا ہے، وہ اقبال ہی کی سوانح عمری ''زندہ رود'' ہے ۔ بلاشبہ اقبالیات میں اس کا درجہ بلند ہے اور اس کے مصنف کی حیثیت سے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں بھی ان کی شناخت اقبال ہی کے حوالے سے ہوگی اور مطالب کتاب کے استناد کی وجہ سے یہی ہوگی کہ لکھنے والا فرزندِ اقبال ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' کے اختتامی حصے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''میں اپنی کوتاہیوں سے باخوبی آگاہ ہوں۔ میں نہ اچھا مصور بن سکا، نہ اچھا ادیب، نہ اچھا
سیاست دان، نہ اچھا وکیل، نہ اچھا جج، نہ اچھا شوہر، نہ اچھا باپ میری زندگی میں آسودگی
میری اپنی محنت کا ثمر نہیں بلکہ میری رفیقہ حیات کی مشقت کا نتیجہ ہے'' (ص ۳۸۳)

اگر اس بیان کو روائتی انکسار کی بجائے ڈاکٹر صاحب کی حقیقت پسندی کا نتیجہ سمجھا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں آپ کو بہت کچھ اہلیہ محترمہ کے ذریعے ملا ہے، وہیں شناخت کے طور پر جو دولتِ بیدار والدِ محترم کے

حوالے سے ملی ہے، اسے بھی صبر وشکر کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنی شناخت بنانے کی کوشش نہیں کی، اس نیک کام کے انجام دینے کا موقع انہیں زیرِ نظر کتاب میں ملا تھا لیکن اس کتاب پر بھی جاوید اقبال سے زیادہ علامہ اقبال چھائے ہوئے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس کتاب کا نام بھی ان کے ایک شعر سے اخذ کیا گیا ہے اور کتاب میں جا بجا انہیں کے اشعار سے فضا ہموار کی گئی ہے۔ اگر اس کتاب میں علامہ اقبال کو حذف کر دیا جائے تو باقی جو کچھ بچے گا وہ جاوید اقبال کی نامکمل داستان حیات ہوگی۔ ''اپنا گریباں چاک'' پر اقبال کا سایہ اس حد تک ہے کہ مجھے اندیشہ ہے، آگے چل کر یہ کتاب یونی ورسٹیوں کے اقبالیات کے نصاب میں شامل ہو جائے گی بعض چیزیں اپنی ضد کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں، اس اصول کے تحت اقبال کو بھی اس کتاب کے ذریعے پہچاننے میں مدد ملے گی۔

مجید نظامی کے دوسرے الزام (جاوید اقبال، علامہ اقبال کے آگے نکل جانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں) کے جواب میں جاوید اقبال فرماتے ہیں:

> ''اب رہ گئی بات علامہ سے آگے نکل جانے کی، یہ تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہونی چاہیے۔ یہی ترغیب تو ہمیں علامہ اقبال دیتے ہیں۔ کسی صاحب فکر سے آگے بڑھ جانے سے مراد اس کی تحقیر کرنا نہیں بلکہ اس کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے اس کے بتائے ہوئے رستے سے نئی راہیں تلاش کرنا دراصل فکری تسلسل کو آگے بڑھانا ہے ۔۔۔۔علامہ اقبال سے آگے بڑھنے کی سعی کو روکنے کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم فکر اقبال کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور ان کے بعد کسی بھی صورت میں فکری تسلسل کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ سوچ علامہ اقبال کی تعلیمات کے برعکس ہے اور اس پر صرف ان کے نادان مریدوں کا ہی اتفاق ہو سکتا ہے۔'' (ص ۶۸، ۶۷)

اس بحث سے تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا یا آگے نکل جانا کوئی غلط بات نہیں ہے۔ لیکن مجید نظامی نے الزام تراشی کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ جاوید اقبال نے کب کہاں اور کس

طرح علامہ اقبال سے آگے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور جاوید اقبال نے اس الزام کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہاتھ پاؤں مارنے کی کوئی وجہ بتائی ہے اور نہ اپنی کوشش میں کامیاب ہونے کا کوئی ثبوت دیا ہے۔ کسی صاحب فکر سے کوئی صاحب فکر ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ افسوس کہ ہم جاوید اقبال کے کسی فکری کام سے بے خبر ہیں۔ یہ آپ بیتی ہمارے سامنے ہے لیکن یہ کوئی فکری کام نہیں بلکہ بے فکری کا نتیجہ ہے یعنی آرام کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ اب لے دے کے ایک ہی معاملہ ایسا رہ جاتا ہے جس میں جاوید اقبال، علامہ اقبال سے آگے نکل گئے۔ اقبال خواہش کے باوجود جج نہ بن سکے، اور جاوید اقبال کو بلا طلب ججی مل گئی۔ مگر یہاں بھی جاوید اقبال خود اقبال ہی کی وجہ سے آگے نکلے کیوں کہ اگر وہ فرزندِ اقبال نہ ہوتے تو جج بھی نہ ہوتے۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ ''جاوید نامہ'' کے مشہور مترجم رفیق خاور نے ایک مرتبہ ایک محفل میں کہا: ''میری فکر وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں علامہ اقبال کی فکر ختم ہوتی ہے''۔ ان سے ایک گذارش کی گئی: ''آپ اپنی فکر کا کوئی ایسا نمونہ بتایئے جو اقبال کی فکر سے آگے کا ہو'' جواب دیا: ''دونوں کا کلام سامنے رکھ کر یہ نمونہ آپ خود تلاش کیجئے''۔

ڈاکٹر انور محمود خالد صاحب! اب یہ تحقیق آپ کے ذمے رہی۔ آپ یہ بتایئے کہ جاوید اقبال کی فکر کب، کہاں اور کیسے علامہ اقبال سے آگے نکلی ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' کا وہ حصہ جس میں مصنف نے عدالتی زندگی کے اپنے تجربات و مشاہدات بیان کئے ہیں۔ بے مثال ہے۔ انہوں نے ہماری عدلیہ اور اور اس کے بعض ارکان کی جو عبرت ناک تصویر کشی کی ہے، وہ ہماری قومی زندگی کے زوال کا لازوال مرقع ہے پچھلے پچاس برسوں میں ایسی مرقع کشی کسی صاحب قلم نے نہیں کی۔ کاش جاوید اقبال اس داستان کو کچھ اور دراز کرتے!

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اردو ٹھیک ٹھاک لکھی ہے، لیکن کہیں کہیں زبان و بیان میں غلطیاں ناگوار حد تک موجود ہیں۔ ایک تو وہ بار بار ''برا ماننا'' لکھتے ہیں (مثلاً ص ۸، ص ۱۴۷) یہ کوئی تہوار نہیں ہے جو منایا جائے۔ یہ ماننے کا محل ہے۔ یعنی ''برا ماننا'' درست ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

''کوٹھی کا داخلہ لکڑی کے چھپر والے بڑے برآمدے کے ذریعے تھا'' (ص ۱۵) معلوم نہیں مصنف کے ذہن

میں چھپر کھٹ کا کیا مفہوم ہے۔ چھپر کٹ تو اس پلنگ کو کہتے ہیں جس پر چھت اور پوشش ہو یا چھتری والے دلہن کے پلنگ کو کہتے ہیں۔ ایک جگہ تو غضب کر دیا۔ علامہ اقبال کے جنازے کے بارے میں لکھتے ہیں ''اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ سے جنازہ خراماں چلتے ہوے۔۔۔۔(ص ۴۲)۔ اگر مصنف کو خراماں خراماں کے معنی معلوم ہوتے تو وہ ایسا ہرگز نہ لکھتے۔ یہ الفاظ محبوب کی خوش رفتاری اور اٹھلا کر چلنے کے لیے آتے ہیں۔ ایسی ہی مضحکہ خیز مثال وہاں ملتی ہے جہاں یہ مقصود تھا کہ کوئی دل لگا کر کام نہیں کرتا۔ فرماتے ہیں! ''یہاں کوئی بھی شخص دل لگی سے کام نہیں کرتا'' (ص ۱۸۹) اسی طرح ''من حیث الگروپ'' (ص ۵۶) ''چڑھ مڑھ ترین'' (ص ۱۷) جیسی تراکیب سے خوش مذاقی کا ثبوت نہیں ملتا۔ ''غلاف اڑھا دیا'' کی جگہ ''غلاف اوڑھ دیا'' (ص ۱۴۸) اسی قبیل کا انداز بیان ہے۔''

املا کی اغلاط بھی کثرت سے ہیں۔ (کتابت یا کمپوزنگ کی غلطیوں سے مختلف) صوفی کی غلط جمع (صوفیاء ص ۱۳ صحیح صوفیہ) سے قطع نظر اس قسم کی بوالعجبیاں بھی ملتی ہیں: برخواست (ص ۶۳) بجائے برخاست مذاحیہ برائے مزاحیہ، معرکتہ الآرا (ص ۱۶۷) بجائے معرکہ آرا، دوشامبے (ص ۲۴۵) بجائے: دوشنبہ، جگہ کا نام، ذق پہنچے (ص ۲۶۹) بجائے زک پہنچے، حامی بھری (ص ۱۶۷) بجائے ہامی بھری۔

اب ایک دو لطیفے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ کتاب کے آخر (ص ۲۶۶) میں لکھا ہے کہ مزار اقبال پر حاضری دی اور الیکشن میں حصہ لینے کے سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ یہ مزار پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال نے قرۃ العین حیدر کی دوستی پر فخر تو کیا ہے مگر ساتھ ہی انہیں یہ طعنہ دیا ہے کہ وہ ہندی کلچر کو پسند کرتی ہیں۔ دو جملے بڑے عجیب و غریب ساتھ ساتھ لکھے ہیں۔ ''جوانی بغیر شادی کے گزار دی میری ان کے ساتھ معصومانہ بے تکلفی تھی'' (ص ۹۷) سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دو جملوں کو ساتھ ساتھ لکھنے کا مطلب کیا ہے۔ بہر حال ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ بلا تشبیہ عرض ہے۔ ایک بہت بڑے شاعر کا بیٹا ایک بہت بڑی ادیبہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مشترک دوستوں نے ان کی ملاقات کرائی۔ ملاقات کے بعد خاتون نے انکار کر دیا۔ وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: ''ان صاحب زادے کا تلفظ ان کے ابا جی کے تلفظ سے بھی زیادہ خراب ہے''۔

آخری بات۔۔۔۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دیباچے میں لکھا ہے: ''اردو ادب میں اپنے سوانح حیات خود

تحریر کرنے کا رواج ہے، اس لیے ادب کی اس صفت کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی''۔ (ص ۵) جس زبان میں تین سو سے زیادہ آپ بیتیاں موجود ہوں اور درجنوں اہم شخصیات نے اپنے مفصل حالات قلم بن کئے ہوں اس بارے میں ایسی سرسری رائے دینا مناسب نہ تھا۔

معذرت خواہ ہوں کہ لکھنے پر آیا تو لکھتا ہی چلا گیا، یہ بھی نہ سوچا کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

بخدمت گرامی

ڈاکٹر انور محمود خالد صاحب

فیصل آباد

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۰ جنوری ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر انور سدید نے علامہ اقبال۔ آئینہ فرزند میں۔ کے عنوان سے اپنے ادبی کالم ادب نامچہ میں اپنا گریباں چاک پر سیر حاصل تبصرہ کیا کچھ حصہ دیکھئے۔

علامہ اقبال کی دانش وافکار کا مجسم نمونہ پاکستان ہے جو تصورات اقبال کی داخلی بصیرت اور عمل سے فی الوقت محروم ہے لیکن بہر حال ایک آزاد مملکت ہے جس کے آئین میں اسے اسلامی ملک قرار دیا گیا ہے اور حقیقی جمہوریت جس کا لائحہ حیات وعمل ہے چنانچہ گزشتہ ۵۵ برس کے عرصے میں تصوّر پاکستان کے اس خالق کو جو ایک عظیم فلسفی اور شاعر تھے ہمیشہ عقیدت کی نظر سے دیکھا گیا اور انہیں عزت اور وقار کے بلند ترین مقام پر فائز کیا گیا کہ ان کا یہ حق اس وقت تک قائم رہے گا جب تک پاکستان اس خطّہ اَرض پر وجود ہے ان کے معارین اور نیاز مندوں نے جن میں سید نذیر نیازی ڈاکٹر عاشق بٹالوی مولانا عبدالمجید سالک محمد عبداللہ قریشی عمیاں محمد شفیع کو بہت اہمیت حاصل ہے ان کے روزمرہ کے معمولات اور ملفوظات کتابی صورت میں پیش کرنے اور ان کی عظمت کا ایک مستحکم نقش قائم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ فریب تصویروں پر مشتمل ہیں اقبال کو ایک عام انسان کی صورت میں دیکھنے کی کوشش کی اور متعدد ایسی باتیں بھی منکشف کر دیں جس انسان کامل بننے والا آدم خاکی اس دنیا کا بالعموم اور خاکِ لاہور کا بالخصوص ایک ایسا فرد نظر آتا ہے جو بھاٹی دروازے میں میکلوڈ روڈ پر اور آخری دور میں میورو ڈ پر ایک سیالکوٹی نژاد لاہوری کی زندگی گزار رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے فکری زاویوں سے پوری آگہی کے باوجود زندگی کی عملیت کا منکر نہیں تھا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب علامہ اقبال کے آخری دور کی ایک ایسی عینی شہادت ہے جو فرزندِ اقبال نے بظاہر اپنے بیان دفاع میں پیش کی ہے اور اس بڑ کے درخت کے حوالے سے جس کا نام علامہ اقبال ہے نکلنے کی سعی کی ہے، تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں بھی اقبال علامہ اقبال ہی نظر آتے ہیں اور ڈاکٹر

جاوید اقبال اپنی نظری حیثیت میں اپنی ذات کو جتنا بھی بلند کرنے کی سعی کریں۔ وہ فرزند اقبال ہی دکھائی دیتے ہیں۔

جنوری ۲۰۰۳ کے آخری ہفتے میں نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن کے تحت ''اپنا گریباں چاک'' پر ایک تقریب منعقد ہوئی اس کی روداد ملاحظہ فرمائیں۔

ہفتہ رواں کے دوران لاہو میں متعدد تقریبات ہوئیں جن میں سب سے اہم تقریب فرزند اقبال جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح عمری اپنا گریباں چاک کی تعارفی تقریب تھی۔ جس کا اہتمام نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن نے ایوان کارکنان تحریک پاکستان میں کیا ہے۔ صدارت سابق نگران وزیراعظم ملک معراج خالد نے کی مہمان خصوصی وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات شیخ رشید احمد تھے۔ ملک معراج خالد نے کہا کہ ''میری خواہش تھی کہ جاوید اقبال بھی اقبال جیسے نکلیں وہ میری تمام توقعات سے بڑھ کر نکلے ہیں۔ اللہ ان کی تڑپ اور لگن میں مزید اضافہ کرے پاکستان کو پروگریسو جمہوری اسلامی مملکت بنانے کیلئے ڈاکٹر جاوید اقبال کی اس کتاب سے رہنمائی لی جائے۔'' شیخ رشید احمد نے کتاب اور صاحب کتاب کو ملک کا بہترین سرمایہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ: جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے کتاب کی تخلیق کے دوران جس جرأت اور ہمت سے کام لیا ہے یہ ان کا خاندانی شیوہ ہے انہوں نے کتاب میں اٹھائے ہوئے ایشوز کے حوالے سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ ان پر لے دے تو ہوگی لیکن انہیں اس کامیاب کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ دی نیشن کے ایڈیٹر جناب عارف نظامی نے کتاب کو جدید دور اور اس کے تقاضوں کے عین مطابق قرار دیتے ہوئے کہا کہ مصنف جیسے خود ہیں ویسے ہی ان کی یہ کتاب ہے انہوں نے اس میں مبالغہ آرائی اور جھوٹ سے کام نہیں لیا جو کچھ سوچا سمجھا کہہ دیا وہ ملا کے اسلام کے نہیں لبرل اسلام کے قائل ہیں۔

اشفاق احمد نے کہا کہ ''اس کتاب کی تحریروں میں ایسا سحر ہے کہ جو ایک مرتبہ پڑھنا شروع کر دے ختم کئے بغیر دم نہ لے اس کتاب میں سب سے متاثر کن چیز ''خود کلامی'' ہے اور پہلے کبھی اس طرز کی تحریر میرے مطالعے سے نہیں گزری اس سے قبل کسی نے اپنے آپ سے ایسے سوالات نہیں کئے جن کا تعلق حالات و واقعات سے ہو ایسے سوالات ایک بڑی سوچ کے فلسفی ہی اپنی ذات سے کرتے ہیں۔'' تقریب سے محترمہ بشریٰ رحمٰن بیگم مہناز رفیع ضیاء

شاہد ڈاکٹر رفیق احمد اور راجہ تجمل حسین نے بھی خطاب کیا اور کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے اظہار خیال کیا اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض شاہد رشید نے انجام دیئے۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے اس کتاب میں ''اپنا گریباں چاک'' کر کے سب کے سامنے رکھ دیا ہے اپنے لئے کچھ احساس نہیں تھا جن کا ذکر اس تقریب میں مختلف مقررین نے کیا ہے۔ اس بھرپور تقریب میں اہل علم و دانش کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔''

''اپنا گریباں چاک'' پر روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ۲۸ مئی ۲۰۰۳ کی اشاعت میں قیوم نظامی کا ایک بھرپور تبصرہ بھی شائع ہوا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' ہر لحاظ سے ایک منفرد تصنیف ہے یہ اپ بیتی بھی ہے سفرنامہ بھی ہے اس میں تاریخ کلچر فلسفہ سیاست تعلیم نظام انصاف سب کچھ موجود ہے اس کتاب کو پڑھ کر آپ گھر بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر سکتے ہیں جاوید اقبال ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کا موقع ملا اور بھرپور زندگی گزاری میں نے اپنی زندگی میں اس قدر بے باک کتاب نہیں پڑھی۔ جاوید قبال کو گلہ ہے کہ وہ اپنے والد کے سائے سے باہر نہ نکل سکے اور اقبال کے نام سے ہی پہچانے گئے انہوں نے خود ہی تحریر کیا ہے کہ وہ ساتویں نہم ایم اے انگریزی اور قانون میں پہلی بار فیل ہوتے رہے جس سے ان کی اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہیں خدا اور اپنے عظیم والد کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ خوشحال اور شہرت سے بھرپور زندگی گزارنے میں کامیاب رہے، اگر وہ فرزند اقبال نہ ہوتے تو گم نام زندگی ان کا مقدر ہوتی۔ جاوید اقبال وکالت، عدالت اور سیاست میں ممتاز مقام حاصل نہ کر سکتے کتاب میں شامل چند دلچسپ مشاہدات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے برطانیہ تشریف لے گئے تو جاوید اقبال نے خط لکھ کر اپنے والد سے گراموفون لانے کا مطالبہ

کیا۔علامہ اقبال نے اپنے بیٹے کے اس مطالبے پر ایک نظم لکھی جس میں نصیحت کی۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر''

جاوید اپنی ہمشیرہ منیرہ سے لڑتے رہتے تھے ایک دن علامہ اقبال نے کہا:

تمہارا دل پتھر کا ہے تم بڑے سنگ دل ہو اتنا نہیں جانتے کہ بہن کے سوا تمہارا اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

علامہ اقبال بھوپال گئے اور اپنے دوست سید راس مسعود کے ہاں قیام کیا ایک دن علامہ نے راس مسعود سے کہا مسعود تمہارا دماغ تو انگریز کا ہے مگر تمہارا دل مسلمان کا ہے راس مسعود حاضر جواب تھے فوراً بول اٹھے اقبال خدا کا شکر کرو کہ میرا دماغ مسلمان کا اور دل انگریز کا نہیں علامہ اقبال کی وفات سے دو ماہ قبل پنڈت نہرو میاں افتخار الدین کے ہمراہ علامہ کے گھر ملاقات کیلئے آئے علامہ بیمار تھے اور بستر پر لیٹے ہوئے تھے نہرو صوفے پر بیٹھنے کی بجائے فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے مصنف نے اپنی کتاب میں ذوالفقار علی بھٹو کی قومی خدمات جنگی قیدیوں کی رہائی اسلامی سربراہی کانفرنس اور ایٹمی ٹیکنالوجی کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے جاوید اقبال بتاتے ہیں کہ فاروق لغاری کو صدارت کے منصب سے ہٹانے کیلئے سینٹر کی حیثیت سے تحریک انہوں نے پیش کی تھی جس پر اراکین پارلیمنٹ نے دستخط کر دیے تھے فاروق لغاری نے خطرے کو بھانپتے ہوئے صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا جاوید اقبال صفحہ ۲۶۶ پر تحریر کرتے ہیں کہ مجید نظامی کے اعزاز میں ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مجید نظامی کنزرویٹو ہیں جبکہ وہ خود لبرل ہیں مجید نظامی نے اپنی تقریر میں فرمایا نہ میں کنزرویٹو ہوں نہ جاوید اقبال لبرل ہیں البتہ یہ حقیقت ہے جاوید اقبال کو علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر بڑا غصہ ہے اور علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں ''اپنا گریباں چاک'' کے بغور مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جناب مجید نظامی کی جاوید اقبال کے بارے میں رائے بالکل درست تھی۔

جاوید اقبال نے کتاب کے آغاز میں ہی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا خصوصی شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے کتاب کے مسودہ پر نظر ثانی کی اور مفید مشورے بھی دیے رفیع الدین ہاشمی ایم اے اردو میں میرے کلاس فیلو تھے

وہ کلاس میں فرسٹ آئے میں حیران ہوں کہ وہ کتاب میں اردو زبان اور گرامر کی غلطیوں کی اصلاح کیوں نہ کر سکے

جاوید اقبال صفحہ ۱۰۰ پر تحریر کرتے ہیں۔

سڈنی یونیورسٹی میں میں نے ایک لیکچر پاکستان پر دیا

اسی طرح صفحہ ۱۰۷ پر رقم طراز ہیں

چند ماہ میں میں نیویارک کی زندگی سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔

پوری کتاب میں میں سے بھری پڑی ہے۔ حالانکہ بڑی آسانی سے اس تکرار سے گریز کیا جا سکتا تھا کتاب کے صفحہ ۲۸۲ پر قرآن کی آیت کو ہی تبدیل کر دیا ہے اور قل العفو کو کلوا العفو تحریر کیا ہے پاکستان کے ایک ممتاز صحافی نے مجھے بتایا کہ جاوید اقبال نے اپنے قلمی مسودہ میں بھی یہ لفظ غلط تحریر کیا ہے اور یہ طباعت کی غلطی نہیں ہے علامہ نے اپنے ایک مشہور شعر میں بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔

جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

جاوید اقبال اردو اور عربی زبان پر بھی مہارت نہیں رکھتے انہیں منفرد مقام حاصل نہ کر سکنے کا گلہ نہیں ہونا چاہئے غالب نے کہا تھا۔

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط

بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

جاوید اقبال نے اپنی زندگی میں ہی تصویر بتاں کو اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے جن کا کوئی جواز نہ تھا۔ کتاب کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال کی روح ضرور بے چین اور بے قرار ہوئی ہوگی افسوس جاوید اقبال نے علامہ کے مدّاحوں اور عقیدت مندوں کے جذبات کا احساس بھی نہ کیا اور سرعام "اپنا گریباں چاک" کر کے اس مقام سے بھی گر گئے جو انہیں عظیم باپ کی وجہ سے ملا تھا کتاب کی قیمت چھ سو روپے ہے جو متوسط طبقے کی قوّتِ خرید سے باہر ہے کتاب میں اگر تصویروں کی بھرمار نہ ہوتی جلد بندی کے لئے موٹا گتہ استعمال نہ کیا جاتا اور موٹا ٹائپ استعمال نہ ہوتا تو کتاب تین سو روپے میں بھی شائع ہو سکتی تھی

یوں معلوم ہوتا ہے کہ پبلشر نے کتاب کو گریس فل بنانے کی کوشش کی ہے خامیوں کے باوجود یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔
دلچسپ اور مندرجات کے حوالے سے بقول انور سدید یہ کتاب ادبی حلقوں میں آتی رہے گی۔

☆☆☆

انٹرویو

''اپنا گریباں چاک'' کے حوالے سے بہت سے سوالات جو اس کے مطالعے اور اس پر تحقیقی کام کرنے کے دوران ذہن میں پیدا ہوتے تھے وضاحت طلب تھے۔ خصوصاً ''دوسرا خط'' میں جاوید اقبال نے مختلف موضوعات کو اپنے مخصوص انداز میں چھوا تھا_____ اور اس حوالے سے انہوں نے اپنے طور پر کچھ جواب بھی تلاش کیے تاہم ان جوابات سے بھی کئی نئے مسئلے اور سوالات پیدا ہوتے ہیں_____ ان کی وضاحت کے لئے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے ایک انٹرویو ضروری تھا۔ میں نے جب فون پر ان سے بات کی انہوں نے بڑی خوشی سے انٹرویو دینے کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

یہ انٹرویو بنیادی طور پر ''اپنا گریباں چاک'' کے حوالے سے ہے۔ لیکن جیسا کہ عام طور پر انٹرویوز میں بات سے بات نکلتی جاتی ہے اور گفتگو کا سلسلہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے_____ اس انٹرویو میں بھی بہت ساری باتیں ''اپنا گریباں چاک'' کے مندرجات کے علاوہ بھی ہوئیں لیکن علامہ اقبال، جسٹس جاوید اقبال، اسلام، پاکستان اور دوسرے کئی قومی اور ملّی حوالوں سے بالخصوص یہ ساری باتیں اہم، دلچسپ اور اقبالیات سے شغف رکھنے والوں کے لئے کسی نہ کسی حوالے سے کارآمد ہیں۔

مقالے کے آخر میں یہ انٹرویو من وعن شامل کیا جا رہا ہے۔ البتہ انٹرویو کے حوالے سے چند باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔

۱۔ یہ انٹرویو ۱۰ ستمبر ۲۰۰۸ء کو جسٹس جاوید اقبال کی رہائش گاہ پر لیا گیا۔

۲۔ اس کا مکمل دورانیہ ساڑھے چار گھنٹے کے قریب ہے۔

۳۔ کچھ باتیں ٹیپ نہیں ہوسکیں چنانچہ جہاں جہاں قدرے بے ربطی اور خلاء کا احساس ہوگا اس کا سبب بعض سوالات یا جوابات کے بعض حصوں کا ٹیپ نہ ہوسکنا ہے۔

۴۔ ایسی جگہوں پر نقطوں سے نشان لگا دیے گئے ہیں۔

۵۔ انٹرویو کے (زیر جائزہ کتاب سے) متعلقہ حصوں کو مقالے کے متن میں ضرورت کے مطابق شامل کیا ہے اور مکمل طور پر اسے ضمیمہ میں دیا جا رہا ہے۔

۶۔ اس انٹرویو میں میرے ساتھ میرے نگران ڈاکٹر ریاض مجید اور معروف سکالر ڈاکٹر انور محمود خالد شامل تھے۔

۷۔ انٹرویو میں جسٹس جاوید اقبال صاحب کے جوابات ہی ٹیپ ہو سکے ہیں کیونکہ ڈیکٹافون (چھوٹا ٹیپ ریکارڈر) ان کے قریب رکھا گیا تھا جبکہ سوال کرنے والے دور بیٹھے ہوئے تھے یوں اس انٹرویو کی نوعیت ان کی ایک طویل خود کلامی کی سی بھی ہے کہ مختلف سوالوں کے جواب میں وہ اپنے آزاد تلازمہ خیال کی وجہ سے جو بھی جواب دیتے رہے اس کو محفوظ کر لیا گیا۔ _____ شائد کہیں کہیں سے انٹرویو کے غیر مربوط اور موضوع سے غیر متعلق ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔

انٹرویو ''ڈاکٹر جاوید اقبال''

ڈاکٹر جاوید اقبال نے فرمایا کہ ''۔۔۔تحقیق میں ''انٹرویو'' تحقیق کا حصہ نہیں ہوتا۔ اصل میں یہ جو کتاب ہے۔ اب اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔'' اس کتاب کے بارے میں بہت سارے لوگوں نے خطوط بھی لکھے کہ بہت ساری غلطیاں رہ گئیں تو وہ اب اس دفعہ کے ایڈیشن میں سے یہ غلطیاں نکال دی گئیں اور دو تین ابواب کا اضافہ بھی کر دیا گیا۔ دو ابواب کے اضافے والا (نیا) ایڈیشن آ گیا ہے لیکن مزید چار Chapter والا بھی آ رہا ہے دسمبر تک یہ کتاب آ جائے گی۔

سوال ____: ''اپنا گریباں چاک'' چھپنے کے بعد اضافے کی ضرورت کس طرح محسوس کی گئی؟

جواب ____: اضافے کی ضرورت اس طرح محسوس کی گئی کہ پبلیشر کا تقاضا تھا کہ اس کو Up to Date کیا جائے مطلب یہ کہ چونکہ زندہ ہوں تو اس وجہ سے جو بھی تاثرات ہیں اکثر میرے وہ تاثرات ہیں جہاں ملک سے باہر جاتا ہوں۔ اکثر کوشش کرتا ہوں کہ نہ جانا پڑے لیکن ایسی صورت ہو جاتی ہے کہ جانا پڑتا ہے ، بلواتے ہیں لوگ، ایسی صورت میں وعدے کو پورا نہیں کر سکتا تو اس لئے پبلیشر تقاضا کرتے ہیں کہ جب باہر جاتا ہوں تو نئی بات ہوتی ہے تو اس لئے اس کا اضافہ ہونا چاہئے۔

تو اس طرح اضافہ ہُوا۔ جو پچھلی دفعہ ایڈیشن چھپا ہے اس میں اضافہ کیا گیا پچھلی دفعہ دو ابواب کا اضافہ ہوا اور اس دفعہ تین ابواب کا اضافہ کیا گیا اضافے کا اور کوئی مقصد نہیں سوائے اس کے کہ جتنی دیر زندہ ہوں اتنی دیر جو بھی تاثرات ہیں ان کو بیان کرتا جاؤں۔

اس وقت جو تین ابواب کا اضافہ ہوا ہے اس میں ایک تو میرا مصر کا دورہ تھا۔ وہ مصر کا جو دورہ تھا اس میں

دریائے نیل پر ایک کروز ہوتا ہے یعنی وہ ایک ایسا ٹور ہے جس میں وہ آپ کو لکسر ایک شہر ہے جہاں سے وہ ٹور شروع ہوتا ہے اور اسوان ڈیم تک جاتا ہے (اسی دوران میں ان کا بیٹا، پوتہ اور بہو تشریف لے آئیں وہ انگلینڈ سے ابھی آرہے تھے۔ جاوید اقبال نے اس سے وہیں بیٹھے بیٹھے ملاقات کی اور اپنی نشست نہیں چھوڑی اور ہمیں وقت دیتے رہے۔) لکسر سے اسوان ڈیم تک وہ دکھاتے ہیں فراعنہ کے مقبرے Valley of Kings وغیرہ وغیرہ ساری جگہوں پر لے کر جاتے ہیں۔ یہ وہ کلچر ہے جو حضرت موسیٰ یا فراعنہ کے زمانے سے چلا آرہا ہے اور دریائے نیل کے دونوں اطراف موجود ہے۔

یہ Portion اس میں Covered نہیں تھا اس لئے نئے ایڈیشن میں شامل کیا اس سال علامہ کا ایک عرس منایا گیا تھا۔ پرویز مشرف نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ علامہ صوفی تھے حالانکہ صوفی نہیں تھے اس وقت میں ملک میں رہنا نہیں چاہتا تھا اور میں نے وہ ٹور قبول کر لیا اور نکل گیا ملک سے باہر اور یہاں انہوں نے ان کے مزار کے اردگرد سارے قبائلی گانے کی محفل کروائی۔

پھر اسی طرح مولانا روم کی ۸۰۰ ویں برسی ترکی اور ایران دونوں ملکوں نے منائی۔ اس سال مجھے دونوں ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یعنی کہ ترکی اور ایران۔ یہ اس کے تاثرات تھے کہ مولانا روم کے مزار پر اب وہاں لوگوں نے مجھے TV Channels والوں نے روک لیا۔ جہاں مولانا روم کے بارے میں خطاب کرتے تھے Lecture دیا کرتا تھا۔ وہاں انہوں نے مجھے بٹھا کر آدھے گھنٹے کا انٹرویو کیا۔ وہاں بہت سارے امریکن ٹورسٹ اکٹھے ہوئے (ہر وقت وہاں یہ ٹورسٹ آتے رہتے ہیں)۔ یہ انٹرویو انگریزی میں تھا اس کی ساری تفصیل ان نئے Chapters میں ہے۔

انہوں نے شکریہ ادا کیا کہ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ یہ جو پیغام مولانا روم کا ہے وہاں پر روس کی ایک سکالر Natalia Prigarina جو کہ علامہ اقبال کے علوم کی ماہر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آٹھ دن سے ہم لوگ لگے ہوئے ہیں اور تقریریں ہو رہی ہیں تم نے تو پندرہ منٹ میں عطر ان کا بتا دیا ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ میں مداری ہوتا تو میں پلیٹ لے کر پھرتا اور پیسے بھی اکٹھے کر لیتا کیونکہ یہ ٹورسٹ

ہیں مجھے پتا نہیں کیوں منتخب کیا گیا اس Purpose کے لئے کہ میرا انٹرویو کیا اور لوگ اکٹھے ہوں تو نتالیہ پری گارینا نے جواب دیا کہ مولانا روم کو پتہ ہے کہ کون کون یہاں آیا ہوا ہے۔ جن کو انہوں نے Chose کر لیا وہ یہاں موجود ہے۔

پھر ترکی سے ایران گیا

تو ہمیں لے گئے شمس تبریز (درویش) کے شہر میں جو ترکی اور ایران کے بارڈر پر ہے۔ اب انہوں نے وہاں یہ کہانی بنائی ہوئی ہے کہ پتہ نہیں خدا بہتر جانتا ہے کہ کسی کو جواب آیا ہے کہ یہ قبر اس کی ہے اور یہ Discover ہوا ہے۔ اب وہ وہاں قبر پر لے گئے وہاں اتنا بڑا ہال تعمیر ہو رہا ہے جس پر شمس سے متعلق معلومات یا اشعار درج ہیں۔

مثلاً جس ہوٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا جس کمرے میں ہمیں ٹھہرایا گیا میں اور میری بیوی اکٹھے تھے تو اتفاق سے ہمیں لگژری سویٹ میں ٹھہرایا گیا (بہت احترام کرتے ہیں ایران میں علامہ کی وجہ سے) اس میں رات کو ہم سوئے خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے وہ کمرہ Chose کیا جس میں ٹیلی فون تھا۔ صبح اس کمرے کا دروازہ نہ کھلا Reception پر فون کیا پہلے ایک ٹیم آئی کھولنے کو نہ کھول سکی پھر دوسری ٹیم آئی بہت لیٹ ہو گئے ناشتہ بھی نہ کر سکے نہا بھی نہ سکے کیونکہ گرم پانی نہیں آ رہا تھا اس وجہ سے یونیورسٹی میں پہنچنے میں دیر ہو گئی بہر حال میں نے ان کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ شمس تبریز آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ تین چار اس طرح کے حوادث ہوئے جن کی وجہ سے وہاں سے نکل نہ سکے وہاں سے تو کہنے لگے کہ وہ آپ کو جانے نہیں دیں گے (ہم بڑے پریشان ہوئے۔)

ہوائی جہاز کے جو ٹکٹ تھے وہ میں نے ردی میں پھینک دیے۔ بعد میں بیوی نے Discover کیا کہ وہ تو جہاز کے ٹکٹ تھے۔ ردی کاغذ پڑے ہوئے تھے تو صفائی کرنے کی کوشش کی۔ (میری عادت ہے صفائی کی) تاکہ کمرے میں کوئی چیز رہ نہ جائے میری بیگم صاحبہ بھی کہتی ہیں کہ دیکھ لو ساری جگہ کہیں کوئی چیز رہ تو نہیں گئی (ابھی اسلام آباد ایک لیکچر تھا) تو میں اپنی عینک وہاں پر بھول آیا ہوں اس طرح کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اپنی جگہ پر وہ سفر عجیب و غریب تھا پھر ردی میں سے کاغذ تلاش کیے۔ اور ٹکڑوں کو جوڑ کر ٹکٹ تیار کیا اور واپسی کا سفر کیا۔

وہ تو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ اقبال پاکستانی تھے وہ تو کہتے ہیں کہ علامہ ایرانی النسل تھے ان کا خاندان ایرانی ہے اور یہ جو تصور ہے کہ وہ کشمیری برہمن تھے یعنی ''سپرو'' تو وہ Link کرتے ہیں ایرانی نام سے (سید علی ہمدانی کے ساتھ بہت سے لوگ ایران سے آئے)۔

ایرانی کہتے ہیں کہ عربوں نے سوائے رسول اللہ ﷺ کے کوئی شخصیت پیدا نہیں کی۔ باقی سب ایرانی ہیں امام ابوحنیفہ بھی ایرانی ہیں اپنے (Nationalism) پر بہت گھمنڈ کرتے ہیں اور فخر بھی کرتے ہیں۔

ایک تو وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص عالم اسلام میں بہتری کا باعث نہیں بن سکتا اگر وہ اہل بیت میں سے نہ ہو تو اقبال کے متعلق بھی یہی تاثر ہے کہ اصل میں تو اہل بیت میں سے تھے۔

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

تو نجف کو بھی بیچ میں لے آتے ہیں اور ان پر الزام بھی لگتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

اسی طرح کی باتیں ہیں وہ میرے ساتھ کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ شاید ایسے ہو گیا ہو تو اس طرح یہ باتیں اس کتاب میں شامل ہیں تو آہستہ آہستہ دو Volume بن جائیں گے۔

سوال ____: ڈاکٹر ریاض مجید نے سوال کیا کہ: اردو میں جتنی بھی بائیو گرافیز ہیں ان میں اتنی تصاویر موجود نہیں ہیں۔ آپ کو بھی Javed Iqbal in Pictures کے عنوان پر الگ کام کرنا چاہئے تھا۔ جیسے قرۃ العین حیدر نے اپنی تصاویر کا مجموعہ ''کف گل فروش'' کے عنوان سے شائع کیا۔

جواب ____: تصویریں تو اس لئے شامل کر لیں تا کہ For question of Truth آپ نے ''زندہ رود'' کا نیا ایڈیشن نہیں دیکھا جو ابھی چھپا ہے۔

''زندہ رود'' کا نیا ایڈیشن سنگ میل والوں نے چھاپا ہے۔ اس میں انہوں میرے پاس جو بھی علامہ صاحب کی تصویریں تھیں وہ شامل کر لیں تصویروں کی شمولیت اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج کل جو پڑھنے والا ہے وہ visual بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

سوال ____: کیا اقبال کے حوالے سے لکھنے کے دوران آپ کو کبھی کوئی رہبری بھی ملی۔

جواب ____ :علامہ کی رہبری کئی چیزوں کے متعلق ہو جاتی ہے۔ یہ تاثر مجھے تب ہوا تھا۔ جب میں نے زندہ رود کی پہلی ورژن چھپی تو میرے کچھ ریمارکس تھے جن کا میں نے دیباچے میں ذکر کیا ہوا ہے تو وہ اس طرح تھا کہ جب میں نے کتاب لکھنی شروع کی تو میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے تو لگتا ہے کہ علامہ کی یہ جو بھی ریسرچ میں نے کی تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ برہمن تھے۔ یہ جو انہوں نے ہندوستان اور پاکستان سے علیحدگی کی صورت پیدا کی ہے یہ برہمنوں کا آپس میں جھگڑا ہے۔

اس رات کو مجھے خواب آیا اور مجھے تنبیہہ کی گئی اور ساتھ بڑی ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور ساتھ ہی کہا کہ جو کچھ تم نے کہا وہ بالکل غلط ہے اور یہ سوچنا بھی غلط ہے اور میری طرف سے جو حقیقت ہے وہ تمہیں کل معلوم ہوگی۔

رات کو تین بجے مجھے خواب نظر آیا۔ میں نے خواب لکھ لیا میری بیوی بھی جاگ گئی اور اس نے کہا کہ تم نے کوئی قابوس یا (Night mare) دیکھا ہے میں نے کہا کہ حضرت علامہ کو میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ کتنی مدّت سے وہ کبھی میرے خواب میں نہیں آئے۔ میں نے ان کو بتایا کہ علامہ نے یہ کہا ہے۔ تو وہ کہنے لگیں کہ کل آپ کو جواب مل جائے گا۔ اس زمانے میں میں ہائی کورٹ میں جج تھا۔ علامہ چونکہ خود بھی وکیل تھے تو اسی زبان میں انہوں نے مجھے یہ پیغام دیا You will recive notice from me tomorrow کہ کہاں غلطی ہوئی۔ اس دن کورٹ میں بھی انتظار کرتا رہا۔ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بج گئے۔ وہ سونے جا رہی تھیں تو میں نے کہا کہ ساڑھے گیارہ بج گئے ابھی تک تو کوئی نوٹس نہیں آیا۔ تو کہنے لگیں کہ ابھی بارہ نہیں بجے انتظار کرو۔ عجیب وغریب بات ہے کہ ابھی بارہ نہیں بجے تھے کہ کوئی پندرہ بیس منٹ پہلے میں کتابیں دیکھنے لگا (ہمارے پاس کوئی اور دولت تو ہے نہیں سوائے کتابوں کے) ایسے ہی کتاب نکالی تو ''روزِ گار فقیر'' میرے ہاتھ میں آئی اور ابھی کھولی تو پہلے صفحے پر ہی ان کی نظم ہے جو کشمیریوں پر لکھی گئی ہے اس کا ایک شعر ہے

تیرے ماتھے پہ ہے اسلام کا ٹیکہ اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

وہ شعر میرے سامنے آیا تو میں نے اسی وقت بیوی کو جگایا کہ دیکھو مجھے جواب مل گیا کہ آئندہ آگے سے

غلطی نہ کرنا۔۔۔۔۔۔۔

۱۹۱۰ء میں ہیلے جو مدار ستارہ ہے اور اقبال نے کہا کہ میں اپنے پوتے کی آنکھ سے اسے دیکھوں گا ۱۹۸۵ء دیکھا گیا۔ یہ ہیلے کا مٹ ۷۵ سال کے بعد آتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں آیا۔ میرے بچوں نے اور میں نے بھی دیکھا۔ بچے کافی عمر کے تھے یعنی ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۴ء میں ان کی پیدائش ہے تو وہ دونوں بڑے بڑے ہی تھے۔

ہیلے کا مٹ کی دم اب ساری تباہ ہو چکی ہے۔ اس زمانے میں جب علامہ اقبال نے دیکھا تو پورے آسمان پر اس کی دم چھائی ہوئی تھی۔ تو اس کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ اب یہ اس طرح کا نہیں رہا، اب ٹوٹ گیا ہے کیونکہ انہوں نے ذکر کیا ہوا ہے تو میں نے اس سے یہ INFERENCE نکالا ہوا ہے کہ پاکستان بنانے سے پہلے جو ایک خط اس وقت قائداعظم کو انہوں نے لکھا ہوا ہے کہ اس میں بڑا اصرار کیا گیا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے مہربانی کر کے اب پاکستان کا ذکر کرو۔ یہی وجہ تھی کہ لاہور میں ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی منٹو پارک میں شریف المجاہد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جس وقت یہ قرارداد پاس کر لی گئی تو قائداعظم نے علامہ کے مزار کی طرف رخ کر کے کہا کہ:

"If Iqbal had been alive today. He would have been happy that we have done exactly what he wanted to do."

یہ الفاظ انہوں نے کہے اور میں اس سے یہ تاثر لیتا ہوں کہ انہیں پاکستان بنتا دیکھنے کی اتنی زبردست خواہش تھی۔ اس سے پہلے تو یہ فوت ہو گئے آٹھ سال پہلے۔ اتنی سخت خواہش تھی کہ وہ مرنا نہیں چاہتے تھے اور دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنی آنکھ سے وہ اپنا تصور Realize ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا مرنے سے پہلے دو کتابیں لکھنے کا بھی ارادہ تھا ایک تو تھی "قرآن جیسے کہ میں اس سمجھتا ہوں" دوسری تھی "فقہ کی تدوین نو" چونکہ وہ چاہتے تھے کہ اس سے ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ "اجتہاد" پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور نئی نئی تعبیریں آتی رہی ہیں اور اب بھی اس کی ضرورت ہے۔

دونوں کتابیں تو وہ نہ لکھ سکے۔ زندگی نے وفا نہ کی لیکن ان کی یہ کہ خواہش تھی جو پاکستان کے لئے لکھنا

چاہتے تھے تو ان کی جو روح خواہ وہ برزخ میں کہیں بھی ہو تو مجھے اپنی جگہ پر یہ خیال ہے کہ وہ میری آنکھوں کو استعمال کر رہے ہیں کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے؟ چونکہ ان کی اپنی تسلی نہیں ہوتی روح ان کی بڑی بے چینی کے عالم میں ہے اور یہ اضطراب جو ہے وہ میری زندگی کا جواز ہے۔

میرا اپنی زندگی کا کوئی جواز نہیں۔ میں جو کچھ بننا تھا بن چکا ہوں جو کچھ کرنا تھا کر چکا ہوں۔ اب میں زندہ رہنا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ ۸۴ سال کی میری عمر ہو چکی ہے لیکن Apparently میری زندگی کا کوئی Purpose نہیں ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اتنی مدت سے کہ میں یہی Project کر رہا ہوں لیکن یہاں اس کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ نہ قائداعظم کے نظریات نہ اقبال کے نظریات۔ ہم چھوڑ چکے ہیں۔ ہم کسی اور ہی سمت روانہ ہو چکے ہیں۔ یہ ملک اب اقبال اور جناح کا نہیں رہا we have to accept this چونکہ ہمارے اپنے سیاست دانوں میں شناسائی نہیں کہ قائداعظم کی قدریں کیا تھیں۔ کس قسم کی ریاست چاہتے تھے قائداعظم پاکستان کو دیکھنا۔ کس قسم کی ریاست علامہ چاہتے تھے پاکستان کو دیکھنا؟

قائداعظم نے اپنی تقریر میں علماء حضرات کے متعلق یہ بھی کہا ہوا ہے کہ یہ پاکستان کے دشمن ہیں۔

''You can't Imagine'' کہ کس طرح کی قائداعظم کی تقریریں ہیں جو علماء کے متعلق ہیں۔ کس نوعیت کی ہیں۔ کافر اعظم کہا ان کو اور یہ جو دیوبندی علماء ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ ''ہم اس گناہ میں شریک نہیں ہوئے جس کے نتیجے میں پاکستان بنا''۔ اس کے متعلق میں نے قائداعظم کی جو تقریریں اور علامہ کے جو نظریات ہیں علامہ نے تو ان سے بھی زیادہ سختی سے کہا ہے۔

''دین ملائی سبیل اللہ فساد''

ان میں خاص طور پر علامہ کے جو تأثرات خطبات ہیں وہ میری نئی کتاب ''خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم'' میں دیکھیں۔ اس کتاب میں میں نے ذکر کیا ہوا ہے کہ علامہ نے اجتہاد کے متعلق سوچا کیوں ہے؟ اور کیوں اجتہاد کے متعلق سوچتے تھے اور تقلید کے کیوں مخالف ہو گئے تھے اور اس کی وجہ بھی تعبیریں تھیں علماء حضرات کی جس کے تحت انہوں نے کہا کہ یہ ہندوستان دارالحرب بن گیا۔ یا تو جہاد کرو یا ہجرت کرو اور جہاد کیا تو مار کھائی کیونکہ جہاد تو

تبھی ہوسکتا ہے کہ جب یقین ہو کہ فتح ہوجائے گی اور آپ پورے تیار ہوں۔توپ کے مقابلے میں تلوار کیا چلے گی۔ہجرت نہیں ہوسکتی تھی۔تو اس طرح جب خلافت کی تحریک آئی تو انہوں نے کہا کہ ہجرت کر جاؤ۔

اس کی وجہ بھی یہ تعبیریں تھیں علماء حضرات کی۔۔۔۔

اپنی طرف سے میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ یہ Burden ہے اور کیوں کہ میرے لئے کوئی وجہ نہیں ہے میری زندگی کا تو کوئی اور مقصد نہیں ہے۔میں نے تو جو کچھ کرنا تھا وہ میں کر چکا ہوں۔بچے ہیں وہ اپنے اپنے مقام پہ ہیں۔آگے ان کی اولاد اپنے اپنے مقام پر ہے۔

وہ اصل میں یہاں ہمارے ہاں تحریک ان کی تھی (میرا اپنا خیال ہے) کہ ہمارے ہاں کوئی ایسی لیڈرشپ نہیں آسکی جو اس کو استحکام دے سکے تعلیمی نصاب میں یکسانیت نہیں پیدا کر سکتے ہمیں دسویں جماعت تک کے بچوں کو پڑھانا چاہئیے تھا کہ قائداعظم کے نظریات کیا تھے؟ اصل میں تو اس موضوع اسلامیات کے بارے میں، بڑا Confusion ہے موضوع ہونا چاہئے پاکستانیت۔اس میں سارا کچھ آجاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جو بھی ہماری Nationalities تھیں جس کی وجہ سے اسلام کو ایک قوت کے طور پر استعمال کیا جاتا تو اس کے لئے اس کی جغرافیائی تعبیر آپ کو ملک کی شکل میں مل جاتی تو اس کی حفاظت اسلام کی حفاظت ہوجاتی۔یہ ذکر میں نے کیا ہے۔

''دوسرا خط'' میں میں نے یہی بحث کی ہے کہ آپ کی مولانا حسین احمد مدنی سے جو بحث ہوئی ہے وہ غلط نہیں ہے۔آپ صحیح ہوں تو وہ بھی صحیح ہے جب آپ کو پاکستان مل گیا تو پھر قومیت ہی کی بنیاد پر آپ کی بھی قوم ہوگئی۔فرض کیجئے کہ ملت کے طور پر آپ مسلمان ہیں لیکن اگر ضرورت پڑے تو ملک کے تحفظ کے لئے تو ایک مسلمان قوت کے خلاف بھی غیر مسلم کے ساتھ مل سکتے ہیں۔جیسے کہ اب ملے ہوئے ہیں

سوال ____:اگر مسلمان مولانا حسین احمد مدنی کی یہ بات مان لیتے تو پاکستان ہندوستان سے الگ نہیں ہوسکتا تھا؟

جواب ____:نہیں اس وقت تو ضرورت تھی اسی لئے برطانیہ کا انگریز ایچ اے آر گب کہتا ہے کہ علامہ

ایک طرف تو اسلامی نیشنلزم کو انسان دوستی کا دشمن سمجھتے ہیں اور دوسری طرف پاکستان بھی چاہتے ہیں۔ اس کا جواب اس نے دیا ہوا ہے کہ علامہ کے جو پیروکار ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کہہ رہے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ تضاد کو اس طرح حل کرتے ہیں کہ کہنے کو یہ کچھ اور کہہ رہے ہیں لیکن ان کی نیت کچھ اور ہے۔

Basically تو یہ مسئلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ علامہ کے ہاں تضاد کی یہ جو کیفیت ہے شعر میں، تضاد نثر کے ساتھ ہے مگر وہ تضاد اس طرح کا ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں صورتیں درست ہیں۔

مثلاً

اگر انہوں نے یہ کہہ دیا

دین ملاّ فی سبیل اللہ فساد

تو ساتھ یہ بھی کہتے ہیں

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

آپ کس طرح نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں اگر الگ الگ فقروں، مصرعوں کو دیکھیں تو پھر اختلاف ہوتا ہے لیکن اگر مجموعی طور پر پورے سیاق وسباق کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو پھر یہ تضاد نظر نہیں آتا۔

اصل میں بات یہ ہے یہ تو Contradiction ہوتی ہے۔ یہ بھی زندگی کا حصہ ہوتی ہے اس لئے۔

سوال ____: اصل میں آپ اب سوچتے ہیں۔ اقبال سے آپ جتنا بھی بچیں لیکن آپ بچ نہیں سکتے؟

جواب ____: یہ میں وہی کہہ رہا ہوں کہ یہ کمبل چمٹا ہوا ہے میں خلاصی تو چاہتا ہوں لیکن ملتی نہیں

سوال ____: اصل میں اقبال سے آپ نے جتنا بھاگنا تھا وہ آپ بھاگ لیے؟

جواب ____: ہاں میں پھر انہیں کی طرف لوٹ آیا ہوں۔

سوال ____: آپ نے ساری زندگی خطبات اقبال کی تفہیم وتعبیر کی ہے لیکن یہ ایک لحاظ سے اقبال کی وضاحت وتشریح ہے۔ آپ خود بھی سوچ رہے تھے کہ اجتہاد کے مسئلے پر کچھ کام کرنا ہے؟

جواب ____: میں نہیں کر سکتا۔ پچھلے دنوں اس مسئلے پر میری بحث ہوئی ہے۔ یوم تاسیس منایا ہے۔

Islamic Advisary Council نے اس کے جو چیئر مین ہیں پروفیسر ڈاکٹر خالد مسعود۔ ان کی خود بھی ''اجتہاد'' پر کتاب ہے عربی کے سکالر ہیں ان سے میں نے گزارش کی تھی کہ میرا عربی پر عبور نہیں ہے اور علامہ کو بھی نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ اس پہ کچھ کریں خاص طور پر علامہ کی جو Desire تھی کہ وہ ''فقہ کی تاریخ لکھی جائے'' تو یہ کس طرح اسلامی فقہ Develop ہوئی ہے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے شاگرد ہیں (ڈاکٹر صاحب فوت ہو گئے ہیں) آپ اندازہ کریں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے شاگرد ہیں جنہوں نے انڈونیشیا میں نئی فقہ کی ترتیب دی ہے۔ وہاں ان کے ہاں اسلامی قانون وراثت ہے۔ اس کے تحت بہن وراثت میں برابر کا حصہ لیتی ہے یعنی بھائی کے برابر کا اور اسی طرح نئی فقہ کے تحت بین المذاہب نکاح جائز قرار دیا گیا ہے یعنی اہل کتاب کے ساتھ پہلے مرد شادی کر سکتا تھا اب عورت بھی شادی کر سکتی ہے۔

جاوید غامدی صاحب کا یہ View ہے۔ یہاں بھی اس کا اطلاق ہونا چاہئے لیکن لوگوں کا اختلاف ہے۔ غامدی صاحب میرے دوست ہیں ہمارا آپس میں اختلاف بھی رہتا ہے۔ جو نئی چیزیں اس میں آئی ہیں وہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ایک شاگرد ہیں جو اقبال کے مداح بھی ہیں انہوں نے اس پر کام کیا ہے۔ جن کو مفتی اعظم بوسینیا بھی کہتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایوب خان نے مجھے کہا تھا کہ اسلامک ایڈوائزری کونسل کا ہیڈ آپ کس کو سمجھتے ہو کہ ہونا چاہئے؟ I Sugested کہ یا فضل الرحمٰن ہونا چاہئے یا ڈاکٹر حمید اللہ کو یہ مجھے حکم دیا گیا کہ آپ United Nation جا رہے ہو تو آپ فارغ ہو کر ان سے ملو اور انہیں میرے Behalf پر راضی کرو۔

میں کینڈا گیا فضل الرحمٰن مان گیا اور حمید اللہ کو پیرس ملنے گیا اس نے کہا کہ میں حیدر آباد سے سیدھا پاکستان آیا تھا لیکن پنجاب یونیورسٹی نے مجھے ٹکنے نہیں دیا اور اسی طرح انہوں نے سلام کو بھی ٹکنے نہیں دیا اس لئے میں وہاں سے بھاگ آیا ہوں۔ اب میں تو واپس جانا نہیں چاہتا کہ میرے ہاتھ پر آٹھ مسلمان روز ہوتے ہیں۔ میں کیوں واپس جاؤں؟ کینڈا اور پاکستان میں اسلام کے لئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے واپس آ کر ایوب خان کو بتا دیا۔

فضل الرحمٰن نے اس عہدے کو قبول کر لیا اور وہ پاکستان آ گیا لیکن اس کو اتنی ذلت سے نکالا گیا کہ فضل الرحمٰن کے شاگرد انڈونیشیا، ملائشیا، بوسینیا میں ہیں۔ انہوں نے وہاں سے اسلام کی کایا پلٹ دی ہے۔ اس کے

متعلق میں نے ''اپنا گریباں چاک'' میں لکھا ہوا ہے کہ ''اقبال کے بعد صرف فضل الرحمٰن'' جدید اسلامی فقہ پر کام کر سکتے ہیں۔

(اس کے بعد میں نے یہ کتاب Correction کے لئے رفیع الدین ہاشمی کو دی تو انہوں نے یہ لائن ہی کاٹ دی میں نے وہ لائن رکھی ہے)

بوسینیا کا شیخ الاسلام مجھے کہتا ہے کہ ''میں تو اقبال سے متعارف ہی فضل الرحمٰن کی وجہ سے ہوا ہوں'' (میں فضل الرحمٰن کا شاگرد ہوں)۔ I want you to diliver lectures. اس نے میرا لیکچر سنا ہوا ہے۔

اس نے مجھے کہا کہ ''ہمیں آپ جیسا مسلمان چاہئے۔ ہمیں ان جیسے مسلمان نہیں چاہئیں'' (میں نے کہا کہ میں تو صحیح مسلمان ہوں ہی نہیں لیکن انہوں نے کہا کہ (You are the right person) کوئی ایسا فردِ واحد نہیں جو آج کے حوالے سے اسلام کی صحیح تعبیر کر سکے۔؟

نہیں I Don't think so کیونکہ صوفی ہماری مدد نہیں کر سکتے۔

میں نے بوسنیا میں اپنے لیکچر میں کہا تھا کہ تم لوگ مسلمان ہو اور یورپ میں رہتے ہو تم یورپ کے Rationalism سے بھی متاثر ہو تم ان Movements سے متاثر ہو جو یورپ میں چلی ہیں جنہوں نے یورپ میں کایا پلٹ دی۔ مذہب کو تو انہوں نے نکال دیا ہے لیکن ان کے ہاں تین Movements چلی ہیں ایک تو Reformation جس کو اقبال نے Reconstruction کا نام دیا ہے۔ اقبال نے Reconstruction of Islam نہیں کہا۔ بلکہ Religious Thought کا نام دیا ہے۔ ہمیں اسلام کی reconstraction کی ضرورت نہیں انہوں نے تو عیسائیت کی reformation کی ہے اور نیا مذہب نکال دیا ہے۔ یہاں نئے مذہب کی ضرورت نہیں اجتہاد کی ہے عیسائیوں میں اجتہاد ہے ہی نہیں۔

وہاں میں نے اپنے لیکچر میں کہا تھا کہ آپ یورپ میں ہو، آپ اسلام سے شناسا ہو، یورپ کی ترقی سے بھی شناسا ہو آپ کیوں نہیں اس طرف توجہ دیتے اس پر وہ کہنے لگا کہ You are the right person۔

یہ اقبال کی بھی خواہش تھی۔

(Honour of state) عزت بیگووچ علامہ کے شعر سے اپنی کتاب کا آغاز کرتے ہیں۔

یہ سارے لوگ Inlighted Islam کی طرف ہیں وہ تو اقبال ہی سے یا جمال الدین افغانی یا ایران میں راشد رضا سے متاثر ہیں۔

یہ اس سکول سے مختلف ہے جو حسن النبا کا یا جماعت اسلامی کا سکول ہے ایران میں میں۔ SCC ہے (Supreme Constitutional Court) وہاں کا ایک کیس میرے سامنے آیا۔ میں نے ہدایت کی ہے Islamic advisory counsil والوں کو کہ مہربانی کر کے ساری دنیائے اسلام میں جو بھی اسلامی قوانین ہیں ان کو اکٹھا کریں تا کہ ہمیں پتا چلے کہ دوسری دنیائے اسلام میں کیسے اسلامی قوانین نافذ ہیں۔

اس میں مجھے پتہ چلا کہ) رجم کی سزا یا سنگساری یا موت کی سزا زنا کے معاملے میں کسی بھی اسلامی ملک میں نہیں ہے سوائے ایران اور سعودی عرب کے دونوں ملکوں میں خفیہ طور پر Sex relationship کی اجازت ہے۔ میں ایران میں تھا تو تحسین فراقی اور میں ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے تھے تو ڈرائیور سوال جواب کرنے لگا۔ اور اس کے ذریعے ہمیں ایران میں اسلامی قوانین کے حوالے سے معلومات ملی۔

سعودی عرب میں مسیار Contract ہے اس کو سن کر حیرت ہوتی ہے وہاں اتنی طلاقیں ہوتی ہیں سعودی عرب میں عورت محرم کے بغیر گھر سے باہر نہیں ہوتی کہیں نہیں۔ جا سکتی موٹر نہیں چلا سکتی خفیہ طور پر شادی کرنے کے لئے یعنی Paper marrage کے لئے Internet پر خواتین خرچہ دیتی ہیں۔ تا کہ وہ باہر نکل سکیں جو لوگ افورڈ نہیں کر سکتے کہ وہ Proper طریقے سے شادی کریں اور وہ سارا خرچہ برداشت کر سکیں تو وہ وقتی طور پر خفیہ شادی Paper merrage کر لیتے ہیں اس کو مسیار کنٹریکٹ کہتے ہیں۔

سوال ____: کیا پارلیمنٹ کو ''اجتہاد'' کا حق نہیں دیا جا سکتا؟

جواب ____: اس پارلیمنٹ سے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ ''اجتہاد'' کر سکے اس Parliament سے کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ نہ ہی پارلیمنٹ اور نہ ہی علماء اس قابل ہیں کہ وہ رہبری کر سکیں۔

دوسری شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے وہ شاگرد ہیں بوسنیا کے مفتی اعظم ہیں (علامہ کے مدّاح ہیں) انہی

کی وجہ سے وہاں Iqbal chair بنی ہے، بوسنیا کے Capital میں انہوں نے Insist کیا کہ میں علامہ پر تین ماہ لیکچر دوں۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں جماعت اسلامی نے اپنا مرکز قائم کیا ہوا ہے۔ احمدیوں نے اپنا عربوں نے اپنا اور وہ ہمیں مسلمان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ان کے خیال میں ہم صحیح مسلمان نہیں ہیں اور ہماری یہ صورت ہے کہ ہم تو صرف اقبال کو Accept کرتے ہیں باقیوں کو نہیں کرتے۔ اقبال کو Accept کرنے سے مراد ہی بغاوت ہے tradition سے۔ بغاوت تقلید سے ان کے ہاں Naturally یہ صورت ہے کہ وہ یورپ کے سینٹر میں ہیں۔ یہاں تو کے سوا ہمیں کوئی چارہ نہیں ہے وہاں پر جو کرسچین بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو حصہ رہے ہیں جو Astra Hungarian Empire ہے۔

میں نے پوچھا تم تو سرب ہو۔ جیسے ہم ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں ایسے ہی تم سربوں سے مسلمان ہوئے ہو۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی اولاد ہیں Unitarians کی اولاد ہیں جو عیسائیت کی ایک تحریک تھی جس کے متعلق وہ اسلام کو کہتے ہیں کہ Chirstian Heiring ہے یہ اس لئے ہے۔ کہ باقی تو یہ believe کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو سولی چڑھایا گیا لیکن یہ Unitarians کرسچین Believe کرتے ہیں کہ ان کو سولی سے پہلے ہی اٹھالیا گیا۔ یہ مسئلہ آپس میں ہے کہ Accession جو ہے وہ Before Crucifixion ہوئی یا After اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارے مسلمان دراصل عیسائیت کا ہی حصہ ہیں لیکن یہ Unitarian بن گئے ہیں۔

یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی باقیات ہیں کچھ تو یہ بھاگ کر سکندریہ میں چلے گئے۔ جس وقت ترکوں نے حملہ کیا اور قابض ہوئے تو ہم نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہم سربوں سے مسلمان ہوئے۔

سوال ____: آپ کتنے دن ٹھہرے؟

جواب ____: تقریباً دس دن اور وہاں لیکچر دیے۔

میں تین ماہ وہاں رہ نہیں سکتا تھا لیکن میں تھوڑے دن ٹھہرا اور دوسرے شہروں میں بھی جا کر لیکچر دیئے۔

دراصل یہ لوگ سارے کے سارے صوفی آرڈر کے ہیں جن کا تعلق خاص طور پر نقشبندیہ فرقے سے ہے۔

وہ سارا وقت صرف کرتے ہیں اللہ ہو اللہ ہو کرنے میں۔ مزاج خانقاہی کا اندازہ ہوا اس طرح کہ چھوٹے سے

شہر میں جہاں قبریں ہی قبریں ہیں ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے گئے اور کوئی بھی تیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہے (جو سربوں نے مارے) وہاں مسجد تھی جہاں مجھے لے گئے ظہر کی نماز کے لئے۔ ظہر کی نماز سے لے کر ذکر ہونے لگا۔ کبھی کھڑے ہو کر ذکر کریں کبھی بیٹھ کر (اوپر خواتین تھیں پردہ نہیں تھا لیکن اوپر کی منزل میں وہ ذکر میں مصروف تھیں) تقریباً ۵ گھنٹے بعد جب باہر نکلے تو میں نے کہا کہ تم جو سارا دن اس طرح ذکر کرتے ہو اور آج جمعہ بھی نہیں تھا تعطیل ہے تو آپ کام کیسے کرتے ہیں، تو ان کے پاس جواب نہیں تھا۔ اس طرح دو تین جگہیں ہیں جہاں تکیے بنائے ہوئے دریا اتنا خوبصورت ہے کہ آپ کو کشمیر یاد آجاتا ہے اگر آپ جائیں تو۔ دریا کے کنارے پہاڑ ہیں۔

وہاں بیٹھ کر ذکر ہوتا ہے۔ ذکر میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ وہ دنیا مافیہا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں پرنس چارلس بھی وہاں گیا اور جوتے اتار کر وہ بھی شامل ہوا اور اس طرح کی دوسری شخصیات بھی۔ میں نے اعتراض کرتے ہوئے یونیورسٹی کے پروفیسر کو کہا کہ آپ کس طرف چلے گئے؟ یہ سارا ترکی سلاطین کا اثر ہے۔ جس زمانے میں ترکوں میں مولانا روم کا اور نقشبندیہ سلسلہ کا چرچا ہوا Dancing Dervish کا یہ ہماری طرح کا نقشبندیہ نہیں ہے۔

میری بڑی خواہش ہے اقبال اکیڈیمی کا Link یونیورسٹیز میں ہو جائے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور یہ وہاں میں نے بہت دفعہ کہا ہے لیکن اقبال اکیڈیمی میں دفتریت زیادہ ہے سہیل عمر میرے بچوں کی طرح ہیں کیونکہ اس کے باپ کی اور میری دوستی بھی بہت ہے لیکن یہ ڈرتا بھی بہت ہے اور پھر مولوی لوگ یہاں پہ کسی کے خلاف اپیل شروع کر دیں تو آخر تک اس کی جان نہیں چھوڑتے۔

سوال ____: کراچی سے ماہنامہ ''ساحل'' نکلتا ہے جو کئی غلط باتیں اقبال سے منسوب کرتا ہے۔

جواب ____: جی ہاں دیوبندی سکول ہے اقبال اکیڈمی والوں نے انہیں جواب دیا ہے۔ یہ لوگ غلط Link قائم کرتے ہیں۔۔۔۔ کہ سید سلیمان ندوی کے ساتھ کہ انہوں نے یہ اعتراض کیا ہے۔ جس شخص نے بھی دعویٰ کیا ہوا ہے تو وہ غلط ہے۔

سوال: آپ کی ''نثر'' کلیات کی صورت میں چھپ چکی ہے یا ابھی آپ کی کئی تحریریں غیر مطبوعہ باقی ہیں۔

جواب: ''جہان جاوید'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔

میرے دون تین 'Plays'' جو اس زمانے میں لکھے تھے وہ نہیں مل رہے۔ تین ڈرامے نہیں ملے۔ ایک تو لکھا تھا جب ''بنگال'' میں قحط پڑا تھا ''لٹھا'' کے عنوان سے یہ ڈرامہ تحریر کیا گیا تھا وہ نہیں مل سکا۔

سوال: کہیں چھپا تھا یا نہیں؟

جواب: ''نقوش'' یا ایک دو اور رسالوں میں چھپا تھا۔

۵۰ء سے ۶۰ء تک میں نے نہیں لکھا۔

سوال____ Vocal lectures محفوظ ہیں یا نہیں؟

جواب____: نہیں مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھپے ہوئے ہیں لیکن میرے پاس محفوظ نہیں ہیں کیونکہ ۱۹۵۰ء سے Lecture دے رہا ہوں۔

سوال____: ''اپنا گریباں چاک'' میں جو اضافے ہو رہے ہیں، جو نئے آپ سفر کر رہے ہیں ان کو بھی شامل کر رہے ہیں؟ جو اصل کتاب آپ نے لکھی تھی ''اپنا گریباں چاک'' اب کبھی کبھار سوچتے ہوئے خیال آتا ہے کہ کوئی اور واقعات زندگی کے یا کچھ رہ گیا تھا اس میں چھپنے سے یا کافی حد تک تمام چیزیں آ گئی ہیں؟

جواب____: میرا خیال ہے کہ کافی حد تک آ گئی ہیں چیزیں۔ یہ لکھنا شروع کیا تھا جب میں گر گیا تھا اور چوٹ آ گئی تھی تقریباً ایک سال میں بستر پر رہا تو اس دوران میں نے لکھنا شروع کیا اور اپنی یادداشت جتنی میں استعمال کر سکتا تھا اس کو کیا۔ حقیقت میں میرا نہیں خیال کہ کوئی چیز رہ گئی ہو۔ کوئی چھوٹی موٹی چیز رہ گئی ہو تو پتہ نہیں ورنہ بڑا واقعہ کوئی نہیں رہا۔

سوال____: جب آپ نے ''زندہ رود'' لکھی تو اس سلسلے میں بعض لوگ افواہیں بھی پھیلاتے رہے ہیں کہ آپ نے پریکٹیکلی کوئی مدد بھی لی تھی اس لکھنے کے دوران میں یا آپ نے سارا Material خود لکھا تھا۔

جواب____: میں نے خود ہی کیا۔ اصل میں میری یہ ٹریننگ جو ریسرچ کی ہے مختلف ہے اس سے جس طرح یہاں کی جا رہی ہے میرا جو تجربہ تھا کیمبرج میں پی ایچ ڈی کا وہ بھی مختلف تھا یہاں اور طرح ریسرچ کی جا رہی ہے۔ سنگ میل والوں نے میرے اس تھیسز کو شائع کیا تھا۔

The Development ofMuslim Political Thought in Indo Pakistan subcontirent

کتابی شکل میں اس کا نام بدل دیا گیا۔

سوال ____: آپ نے اپنی کتاب میں قرۃ العین حیدر کا ذکر بڑی شفقت اور اپنائیت سے ذکر کیا ہے انہوں نے بھی ''اکار جہاں دراز ہے'' میں آپ کا ذکر کیا بڑے ہی ادب کے ساتھ کیا بعض لوگ یہ افواہ پھیلاتے ہیں کہ شاید آپ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے؟

جواب ____: نہیں ہم دونوں میں بے تکلفی بہت تھی اس وجہ سے کہ علامہ اقبال کے ان کے والد سجاد حیدر یلدرم سے بہت اچھے تعلقات تھے اسی وجہ سے ان سے آپس میں بے تکلفی تھی ہوا یہ کہ وہ علامہ کو نام سے نہیں پکارتی تھیں ہمیشہ جاوید کے ابا کہہ کر پکارتی تھیں۔ ایک دفعہ ہمارا جھگڑا بھی ہوا تھا۔

مشرقی پاکستان میں ایک ہندو ٹیمپل میں جا کر وہ پوجا کرنے لگی تو میں نے پھبتی کسی تو وہ ناراض ہوگئیں بولنا بند کر دیا۔ پٹی بہت تھیں۔ تجمل حسین نے صلح کروائی ''آگ کا دریا'' پر جب میں نے تبصرہ کیا تو پھر ناراض ہوگئیں۔

میرے اس قسم کے مضامین سے مختلف مضامین بھی اخباروں اور میگزین چھپتے رہے۔ قائداعظم کی زندگی میں Dawn میں دو مضمون انگریزی میں چھپے تھے۔ ایک کا عنوان تھا Quaid Azam the Over man اس وقت میں MA میں پڑھتا تھا۔ اصل میں اس زمانے میں Superman کے مقابلے میں انگریز مصنف جانسن نے Overman کا تصور دیا۔ کہ انسانوں میں بعض ایسی شخصیات پیدا ہوتی ہیں جو عام انسانوں سے بلند ہوتی ہی اور سپر مین میں نے ان کو نہیں کہا کیونکہ وہ Concept ماورائی ہے۔ میں نے اس مضمون میں ثابت کیا کہ کس طرح جناح اوور مین ہیں وہ مضامین قائد نے پڑھا اور اس کا مجھے جواب آیا۔ وہ خط بھی مجھ سے ضائع ہوگیا بہرحال اس کا ذکر شریف المجاہد نے کیا ہوا ہے اپنی کتاب میں۔ ایک مضمون اسلام اینڈ پاکستان، یہ شاید ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں لکھا۔ جب میں نے یہ لکھا تو سردار عبدالرب نشتر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا کہ جس اسلام کی بنیاد پر پاکستان بنانے کا آپ دعویٰ کر رہے ہیں وہ ''اسلام'' وہ نہیں جو علماء یا مولویوں کے

وژن کا ہے۔ یہ جدت پسندی بھی میں نے Inherit کی ہے۔ اقبال کے متعلق بھی یہ الزام تھا کہ وہ جدت پسند ہیں یہ مضمون بھی قائداعظم نے بہت پسند کیا لیکن میرے پاس کوئی سند نہیں ہے کہ قائد نے یہ دونوں مضمون پسند کیے ہیں۔

شریف المجاہد اس زمانے میں سیکرٹری ہوتے تھے انہوں نے خط لکھا کہ قائد نے یہ دونوں مضمون پسند کیے ہیں۔ آپ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ Dawn اس زمانے میں نیا نیا شائع ہوا تھا۔ میرے پاس تھے لیکن جب جاوید منزل حکومت نے لے لی اور ہم سرکاری گھر میں آ گئے تو وہاں بارشوں یا شاید چوہوں نے ضائع کر دیے۔

میرے کئی آرٹیکلز چھپتے رہے ہیں ''احسان'' میں ''شہباز'' اخبار میں بھی چھپتے رہے۔ جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔

سوال ____: آپ کے دونوں بچوں میں لکھنے کی طرف کوئی راغب ہوا؟

جواب ____: نہیں کوئی بھی نہیں۔ بڑا لکھتا ہے کچھ۔ اگر اس کا موڈ ہو تو لکھ لیتا ہے۔ لیکن ادبی تحریریں نہیں۔

سوال ____: آفتاب اقبال کے بچوں میں سے بھی کوئی لکھتا ہے یا نہیں؟

جواب ____: نہیں ان کی طرف سے بھی کوئی اس طرف نہیں آیا۔

میرے بچے بعض اوقات مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم ''شیلے، کیٹس اور غالب'' کو نہیں جانتے، تو اصل وجہ یہ ہے کہ آج کا دور بدل گیا ہے۔ ویلیوز بدل گئی ہیں، سائنس اور کمپیوٹر کا دور آ گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو مہذب ہی اس کو سمجھا جاتا تھا جو ادب پڑھتا تھا۔

سوال ____: اقبال کے حوالے سے کوئی Mega Project ہے۔ آپ کے پیش نظر؟

جواب ____: میگا پروجیکٹ تو کوئی نہیں ابھی تو علامہ کی نثر پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نثر پر اس لئے توجہ نہیں دی جاتی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ علماء حضرات اعتراض کریں گے۔ تو اب میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں تو وہ کہہ رہے ہیں کہ ساری نثر کو اکٹھی کر رہے ہیں۔ یونیورسٹیز کا ماحول اب ہمارے زمانے کے مطابق نہیں رہا۔

سوال: یہ جو مشرف کے زمانے میں ایک ادارہ بنایا گیا تھا اس کا کیا بنا؟

جواب: اس میں کروڑوں کے فنڈ لگائے گئے لیکن بنا کچھ بھی نہیں۔ اقبال پر فلم کے لئے سارا پیسہ

''ناروے'' کی حکومت نے دیا ہوا ہے۔لیکن اس پر بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی۔''زندہ رود'' پر ہی اس فلم کا انحصار ہے لیکن ابھی مکمل کام نہیں ہوا۔اقبال پر دو تین فلمیں بن چکی ہیں لیکن وہ ناقص قرار دی جا چکی ہیں۔پہلی فلم تو ''فیض'' نے لکھی تھی فقیر وحیدالدین نے پیسے دیے تھے اور کاردار نے اس کو ڈائریکٹ کیا تھا۔

زیادہ تر اس Project میں اقبال کو Socialist یا Economist قرار دیا گیا تھا۔

دوسری فلم جو بنی وہ واجپائی لے کر آئے تھے ضیاء الحق کے زمانے میں۔علی سردار جعفری نے ہندوستان میں بنائی تھی۔اس میں دکھایا گیا تھا کہ اقبال کا پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔تیسری فلم ہمارے پی ٹی وی نے بنائی تھی لیکن ضیاء الحق نے اس کو ناقص قرار دے دیا۔

اب جو کوشش ہو رہی ہے وہ فلم نہیں Drama ہے۔ناروے مشہور ہے البسن کی وجہ سے جس نے ناروے میں وہی کچھ کیا جو اقبال نے پاکستان کے لئے کیا۔سپین کی آزادی کے لئے لورکا نے بہت کام کیا اس زمانے میں عورتوں پر خاص طور پر بہت سختی تھی۔

سوال ____: آپ کے نام مشاہیر کے بہت سے خطوط آئے کیا ان کو محفوظ کیا؟

جواب ____: نہیں کسی کو محفوظ نہیں کیا اور خاص خط و کتابت کسی سے نہیں رہی۔اپنے زمانے میں شاید میں ان کو محفوظ نہ کر سکا اور زیادہ آئے بھی نہیں ہیں۔زیادہ خطوط عطیہ فیضی کے آئے ہیں۔

عطیہ فیضی کی اور اقبال کی بہت قربت تھی۔اقبال کی پہلی بیوی سے اس لئے نہیں بنی تھی کہ وہ بہت امیر گھرانے سے تھیں یعنی گجرات میں ان کے والد وائسرائے کے سپیشل ڈاکٹر تھے اور بڑی حویلی کی پیداوار تھے اور یہ بے چارے اقبال غریب لوگ لوئر مڈل سے ان کا تعلق تھا۔اقبال کی شکل اچھی تھی شاید اس وجہ سے رشتہ طے پایا۔

پہلی شادی اس لئے ختم ہوئی کہ امیر گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے نبھ نہ سکی۔بھائی کے خرچ پر تو یہ پڑھ رہے تھے۔اس کے علاوہ سولہ سال کی عمر میں شادی کروادی گئی۔

سوال ____: معاشی طور پر دونوں خاندانوں میں تفاوت تھا تو یہ رشتہ کیسے طے ہو گیا۔؟

جواب ____: ہمیں اس کے متعلق بھی پوری معلومات نہیں ہیں لیکن اقبال امتحان دینے کے لئے گجرات

سنٹر میں گئے تو ان کے خاندان کے کسی فرد نے ان کو دیکھا۔ شکل وصورت سے متاثر ہو کر یہ رشتہ طے پایا۔ تین سال کا عمروں کا فرق تھا۔ ان کا سیالکوٹ والے گھر میں رہنا کافی مشکل تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں پورا گھر بنا بھی نہیں تھا۔ یہ بے چارے تو کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ دو کمرے تھے۔ شادی کے بعد ایف اے تک وہیں رہے۔ دو بچے پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد آپ لاہور آ گئے تعلیم کے لئے۔ لاہور میں یہ ہوسٹل میں تھے اور وہ وہاں رہتی نہیں تھیں۔ وہ اپنے والد کے گھر چلی جاتی تھیں پھر وہ تعلق نہیں رہا۔ ادھر عطیہ کی کوشش یہی تھی کہ وہ ان سے شادی کریں۔ لیکن اقبال نے یہ تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ ایک اور رسک لینا نہیں چاہتے تھے۔

سوال ____: علامہ کا رویہ آفتاب کے ساتھ بہت سخت تھا؟

جواب ____: ہاں اقبال کا Bitterness کا رویہ تھا۔ حالانکہ Bitterness کا رویہ تو بیٹے کی طرف سے ہونا چاہئے تھا لیکن اقبال کا رویہ زیادہ سخت رہا۔

یہ ہماری خاندانی عادت ہے۔ میرے والد کی عادت تھی کہ جب کسی سے ایک دفعہ چپقلش ہو جاتی تھی تو یہ ان کو معاف نہیں کرتے تھے۔ تایا تو بہت سخت تھے لیکن میں نہیں اس طرح کا' کیونکہ مجھ پر ماں کا زیادہ اثر پڑا ہے۔ ماں کی طرح طبیعت زیادہ ہے میری۔ میں ان کی طرح سخت مزاج نہیں ہوں۔

ہماری پھوپھی تھیں پھوپھا نے دوسری شادی کر لی وہ واپس میکے آ گئیں۔ کتنی مدت تک وہ اپنے باپ ہی کے گھر میں رہیں۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ ان کے شوہر لینے آ گئے تو والد نے کہا کہ چلی جاؤ لیکن علامہ ناراض ہو گئے کہ میں نہیں جانے دوں گا۔ لڑتے رہے۔ والد نے کہا کہ قرآن میں آیا ہے کہ ''**صلح خیر**'' تو پھر چپ کر گئے۔

دوسرا واقعہ ہے کہ فقیر کو مارنے دوڑے۔

سوال ____: یہ واقعہ ''اسرار خودی'' میں بھی آیا ہے۔ فقیر اڑیل تھا مانتا نہیں تھا۔ اسے مارا تو والد ناراض ہو گئے کہ میں قیامت والے دن رسول اللہ ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔؟

جواب ____: اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں۔ ان کی طبیعت اس طرح کی تھی۔ سخت تھے مجھ پر بھی

بچپن میں سختی تھی۔ میں زمین پر سویا تو پسند کیا۔ نماز پڑھتے دیکھا تو پسند کیا کبھی کہا نہیں کہ نماز پڑھو کبھی تھپڑ بھی مارے کیونکہ میں بہت شرارتی تھا وہ مزید زندہ رہتے تو ہوسکتا ہے کہ میرا بھی وہی حشر ہوتا جو آفتاب کا ہوا۔

سوال ____: اقبال تو اقبال ہی تھے۔ آپ نے الگ بھی بہت کام کیا لیکن ٹریجڈی یہ ہے کہ لوگ آپ کو Compare کرتے ہیں علامہ کے فن سے حالانکہ آپ نے جو کام کیا ہے وہ اپنی جگہ لازوال ہے۔ آپ کی کتاب ''زندہ رود'' پڑھ کر کوئی تشنگی رہ نہیں جاتی۔

جواب ____: اقبال کی یہ بائیوگرافی میں نے انگلینڈ سے آکر لکھی۔ ریسرچ کا طریقہ میں نے پی ایچ ڈی کرتے ہوئے سیکھا۔ اس کتاب پر بہترین کمنٹری چھپی ہے جو صباح الدین عبدالرحمٰن نے المعارف میں لکھی جو اعظم گڑھ سے نکلتا ہے اس میں چھپی تھی۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے ''جاویدان اقبال'' کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

سوال ____: گریز اور کشمکش کے حوالے سے بعد میں آپ کے خیالات میں کوئی تبدیلی آئی؟ آپ کی شناخت کا غالب حوالہ علامہ اقبال ہیں یا آپ کی انفرادی تخلیقی صلاحیت؟

جواب ____: سمجھوتہ تو ہو گیا تھا۔ یہ ایک زندگی کا دور تھا جس میں میری اپنی طرف یہ کوشش تھی کہ بڑے درخت کے سائے سے نکلوں اور الگ پہچان کراؤں بھی یہ انہی کا دیا ہوا سبق ہے کہ ''اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر اپنی خودی کو پہچاننے کی کوشش کرو'' یہ انہی کا پیغام تھا جس کی وجہ سے میں ان کے آخر سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سوال ____: گویا پہلے آپ ''اسرار خودی'' کی منزل میں تھے اب ''رموز بے خودی'' میں داخل ہو گئے ہیں؟

جواب ____: ہاں سمجھوتہ اس بنا پر ہو گیا تھا۔ Because of age۔ عمر میری اتنی گزر چکی ہے لیکن پھر بھی مجھے اقبال کا چھوٹا سا بیٹا سمجھا جاتا ہے یعنی فرزندِ اقبال اب تو سمجھوتہ اس لئے کر لیا اب میں کیا کروں۔ اب میری عمر اپنی اتنی ہو گئی ہے۔ اب کوئی سمجھتا ہے تو سمجھ لے۔

میرے بچوں نے جب جاوید منزل چھوڑنے لگے تھے تو انہوں نے پوچھا تھا۔ کہ اب ہم کیا کریں گے؟ آپ کیا کریں گے؟ ہمارا کیا بنے گا۔؟ میں نے کہا کہ تم کو بوتل میں بند کر کے یہاں رکھیں گے۔ تو انہوں نے کہا

کہ اب آپ کیا کریں گے؟ تو میں نے کہا کہ ''میں تو پہلے ہی بوتل میں بند ہوں''۔

بعض میرے اپنے احباب ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی تمہیں ملا ہے یا جو کچھ تم حاصل ہے۔ وہ باپ کے نام کی وجہ سے کر رہے ہو لیکن میرا یہ اپنا خیال ہے کہ نہیں میں جتنا باہر جاتا رہا ہوں مجھے جو اتفاق ہوا باہر جانے کا وہ علامہ کی وجہ سے نہیں وہ میری وجہ سے مجھے بلاتے تھے۔ بعض لوگ جانتے نہیں ہی تھے کہ علامہ اقبال کون ہیں۔؟

سوال ____: آفتاب اقبال نے بھی بار ایٹ لاء کیا۔ خوشحال زندگی گزاری۔ آفتاب کا کیوں اتنا احترام نہیں ہوا جتنا آپ کا ہو رہا ہے؟

جواب ____: وہ یہ کام کرتے نہیں تھے لکھنے لکھانے کا۔ بھائی آفتاب کہا کرتے تھے کہ ''جس طرف تم چلے گئے ہو میں نہیں جا سکتا''۔ تمہیں تگ و دو کرنی پڑی۔ میرے پاس میٹریل نہیں ہے۔؛ تمہیں باپ سب کچھ دے گیا مجھے کچھ نہیں دیا ساری زندگی انہیں تگ و دو کرنی پڑی۔ جو آسودگی انہیں حاصل ہوئی تو وہ تو زندگی کے آخری ایام میں حاصل ہوئی جب کراچی آ کر انہوں نے وکالت کا آغاز کیا تو پھر حالات میں بہتری ہوئی۔

سوال ____: والد صاحب فوت ہوئے تو آپ ۱۴ سال کے تھے آپ کو والد نے نہ فارسی پڑھائی نہ عربی۔ پڑھنے لکھنے کا کام آپ نے ذاتی طور پر کیا؟

جواب ____: مجھے اس زمانے میں پڑھائی کا شوق قطعاً نہیں تھا۔ اس زمانے میں فیل ہوتا رہا ہوں۔ البتہ فکر اقبال کے ساتھ میرا link شروع سے رہا ہے ایک تو چوہدری محمد حسین کا اثر بہت غالب رہا ہے۔ دیوان غالب انہوں نے مجھے پڑھایا۔ اس زمانے سے جو روحانی تعلق میرا ان سے قائم ہوا تو ایک طرح سے میں ان کو باپ زیادہ سمجھتا ہوں۔ انہوں نے میری ساخت بنائی۔ بنانے والے وہ ہیں۔ انہوں نے کلام اقبال میں جاوید نامہ پڑھایا۔ دیوان غالب نے تو میری زندگی ہی بدل دی اسی لئے میں نے ایم اے انگریزی کا ارادہ کیا اور اسی وجہ سے ادب کی طرف راغب ہوا۔

سوال ____: والدہ کی وفات کے بعد کون رہا آپ کے پاس؟

جواب ____: پہلے تو عزیز رشتہ داروں میں سے کوئی نہ کوئی رہنے آ جاتا تھا۔ پھر آنٹی ڈورس مستقل طور پر

آئیں۔ وہ آخری عمر تک یہیں رہیں اور فوت بھی ادھر ہی ہوئیں۔ کرسمس کے موقع پر ہم جاتے ہیں ان کی قبر پر دعا کے لئے۔ ان کی بہن بوٹنی کے ایک پروفیسر حیدری علی گڑھ میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ہٹلر کے زمانے میں مس ڈورس جرمنی سے ہندوستان میں اپنی بہن سے ملنے کے لئے آئی تھیں۔ شادی کی تو شوہر ان کا حیدرآباد دکن میں تھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔ جرمن لاء کے تحت جس نے غیر جرمن سے شادی کی ہو تو وہ پھر اسی کے ملک میں جا کر Divorce لے تو وہ Divorce لینے کے لئے آئی تھیں۔ طلاق لے کر بہن کے پاس علی گڑھ رہنے لگیں۔ جب ہمیں کوئی خاتون نہ ملیں۔ پہلے تو کبھی پھوپھیاں آتیں یا تائی وغیرہ۔ منیرہ کسی سے مانوس نہیں ہوئی تھیں۔ وہ چھوٹی تھیں۔ تقریباً چھ سال پہلے یہاں دیکھ بھال کے لئے کسی خاتون کو رکھنے کی کوشش کی کوئی دیسی یا مسلمان خاتون نہ مل سکیں۔ اس لئے پھر مس ڈورس کو رکھا گیا۔ یہ زیادہ انگریزی ہی بولتی تھیں۔ منیرہ کی شادی اور میری شادی تک رہیں پھر جرمنی چلی گئیں وہاں پر بہت بیمار ہو گئیں تو منیرہ کو لکھا کہ آ کر لے جاؤ تو پھر منیرہ انہیں جا کر لے آئیں ان کا بیٹا ماں کے ساتھ جا کر انہیں جا کر لے آیا وہ اتنی بیمار تھیں کہ انہیں اٹھا کر لایا گیا اور سال پھر بیمار رہنے کے بعد وفات پا گئیں۔

ہمشیرہ نے ان سے بھی جھگڑا کیا۔ ایک دفعہ سکول سے لے کر آ رہی تھیں۔ تانگے والے نے پوچھا کہ یہ آپ کی بیٹی ہیں تو کہا کہ نہیں، میں ان کی نگہداشت کرتی ہوں تو منیرہ ناراض ہو گئیں کہ ویسے تو آپ مجھے بیٹی بیٹی کہتی ہیں اور میں ماں کہتی ہوں لیکن تانگے والے کے سامنے آپ نے انکار کر دیا۔

سوال ____: ویگے ناست کا آپ سے تعلق رہا ہے؟ کبھی آپ انہیں ملے؟ کوئی خط و کتابت؟

جواب ____: نہیں کوئی خاص نہیں۔ جرمنی میں ''نیکر'' دریا کے کنارے وہ علامہ کے ساتھ سیر کیا کرتی تھیں اس مقام پر بہت خاموشی ہوتی تھی۔ اب بھی وہ مقام پر اسرار اور خاموش ہے۔ این میری شیمل کا بنوایا ہوا کتبہ لگا ہے جہاں وہ علامہ کے ساتھ سیر کیا کرتی تھیں۔

سوال: آپ دو دفعہ مسجد قرطبہ میں گئے ہیں۔ پہلی دفعہ دیکھا تو گھبرا کے آ گئے۔ آپ قرطبہ دوبارہ اقبال کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو وہاں بھی گئے اور نوافل بھی پڑھے لیکن جو تاثر علامہ کا مسجد قرطبہ کو

دیکھنے کے بعد ہوا اور جس طریقے سے انہوں نے وہ نظم لکھی تو آپ کے جذبات اس طریقے سے Move ہوتے نظر نہیں آئے؟؟

جواب: میں قرطبہ دو دفعہ گیا ہوں۔ ایک دفعہ جب سردار اقبال کے ساتھ ہم گئے۔ دوسری دفعہ جب اس صدی کی سب سے بڑی اقبال کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس قرطبہ میں منعقد ہوئی۔ اس میں پیسہ دینے والا تو کویت تھا انتظام کرنے والا کوئی پروفیسر تھا۔ President of Pakistan نے جانا تھا لیکن وہ جا نہ سکے تو پھر میں نے کانفرنس اٹینڈ کی۔ یہ وہیں ہوئی جہاں اقبال کی نے نماز پڑھی تھی۔

سب سے پہلے میں نے مسجد قرطبہ پر اقبال کی اردو کی نظم پڑھی۔ میرے بعد یہ ہسپانوی زبان میں پڑھی گئی اور جس نے ہسپانوی میں اس کا ترجمہ کیا تھا وہ خاتون میکسیکن تھیں پھر فرنچ میں فارسی اور پھر عربی میں اس کا ترجمہ پڑھا گیا اس میں کوئی تقریر نہیں ہوئی تھی صرف اس نظم کا ترجمہ مختلف زبانوں میں پڑھا گیا۔ پھر اس کے بعد کانفرنس شروع ہوئی۔

سوال ____: قرۃ العین حیدر نے کیا خوب کہا تھا کہ اردو نظم ابھی تک ''سلسلۂ روز و شب'' سے آگے نہیں بڑھی۔

جواب ____: جب ہم سردار اقبال کے ساتھ پہلی دفعہ قرطبہ گئے تو جب بس پہنچی تو رات کے نو یا ساڑھے نو کا ٹائم تھا۔ مسجد کے سامنے میں والے ہوٹل میں ہم ٹھہرے اور سردار اقبال نے دیکھا کہ مسجد کے دروازے بند تھے۔ وہ تو اب کلیسا ہے اس لئے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ ہم باہر سے طواف کر کے آئے تو تھکے ہوئے تھے سو گئے۔ واپس آئے تو سردار صاحب نے پوچھا کہ قرطبہ کیا ہے؟ یہ مسجد کیسے بنی؟ وہ اس دوران سو جاتے تھے اس وقت مجھے علامہ صاحب کا خیال آیا وہ جس وقت بے چینی کے عالم میں ہوتے تھے تو نذیر نیازی جو پاس بیٹھے ہوتے تھے تو علامہ انہیں کہتے تھے کہ کوئی داستان سناؤ جس میں اندلس کا ذکر ہو مجھے نیند نہیں آ رہی۔

سوال ____: سر یہ واقعہ آپ کی کتاب میں بھی پڑھا تھا لیکن آپ کی زبانی سن کر اور آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر Feelings اور Strong ہو گئی ہیں۔ لیکن سر یہ بتائیے کہ ''اپنا گریباں چاک'' میں جو ''دوسرا خط'' آپ نے تحریر کیا ہے۔ قاری کو اسے سمجھنے میں بہت مشکلات پیش آتی ہیں، اگر قاری آپ سے پوچھے تو اس کے

سوالات کا آپ کیا جواب دیں گے؟

جواب ____: کون سے سوالات؟

سوال ____: آپ قومی ریاست کی بات کرتے ہیں تو اس کے کون سے پوائنٹ کو لیتے ہیں؟ سیاسی، مذہبی، لسانی، معاشی یا جہاد کے حوالے سے دیکھا جائے تو آپ مذہبی ریاست کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

جواب ____: دراصل بات یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد آپ کی جغرافیائی ساخت قومی ساخت سے منسلک ہوگئی۔ آپ کے ہاں قوم پہلے وجود میں آئی، قوم اسلام کے نام پر آئی وطن بعد میں۔ قوم کے لئے آپ نے وطن تلاش کیا ہے اب جبکہ وطن بن گیا تو اب آپ کی شناخت ''اسلام'' قومیت دراصل ہے Territory سے منسلک ہوگئی سو جب Territory سے قومیت منسلک ہوجائے تو وہ Nationalism بنیادی طور پر جغرافیائی ہوجاتا ہے۔

بجائے اس کے کہ یہ مسئلہ ''علمی'' یا ''روحانی'' رہتا یکساں ''روحانی مطمع نظر'' آپ کی Unity کا باعث بنا ''من حیث القوم'' قوم جو ہے مغربی اصطلاح کے مطابق یا نئی اصطلاح کے مطابق لسانی، نسلی اور جغرافیائی، ان تین چیزوں کا اکٹھا ہونا ''قوم'' بناتا ہے۔ United Nation کا ممبر بننے کے لئے عملی طور پر ان تین شرائط کا ہونا ضروری ہے وہی ریاست United nation کی ممبر بن سکتی ہے جو قومی ہو جغرافیائی ہو، مقتدر یعنی National Soverign and Territory ہو۔ اب جب آپ کی قومیت بھی داخل ہوگئی Soverign بھی ہوگئی Territory بھی ہوگئی۔ جب یہ تینوں چیزیں اکٹھی ہوجاتی ہیں تو ان میں سب سے Dominating Element جغرافیائی Aspect ہے۔

اس کی جو جسمانی شکل ہے اس میں تو ''اسلام'' صرف روح ہی رہ گیا نا اب روح کی حفاظت یا زندہ رہنے کے لئے آپ ''جسم'' کو Protect کرتے ہیں کہ نہیں۔؟ بیماری کی حالت میں یا کوئی آپ پر حملہ کرے تو اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں نا؟ جسم کو بچا رہے ہیں یا روح کو بچا رہے ہیں۔؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ Territory ہوگئی۔ اس کا تحفظ کرنا ایک طرح سے اپنی روح کا تحفظ کرنا یا

مذہب کا تحفظ کرنا ہو گیا۔

اس فقرے پر ہی میں نے علامہ اقبال کو یہ سوال کیا ہُوا ہے کہ اب آپ کے اور حسین احمد مدنی کے اختلاف کی گنجائش کہاں رہی؟ اس کا جواب اقبال یہی دیں گے کہ اس وقت ہم Nation کی تعمیر کے مرحلے میں تھے۔ ابھی وطن حاصل نہیں کیا تھا۔ جب وطن حاصل کر لیا تو پھر تم ٹھیک ہو۔

☆☆☆

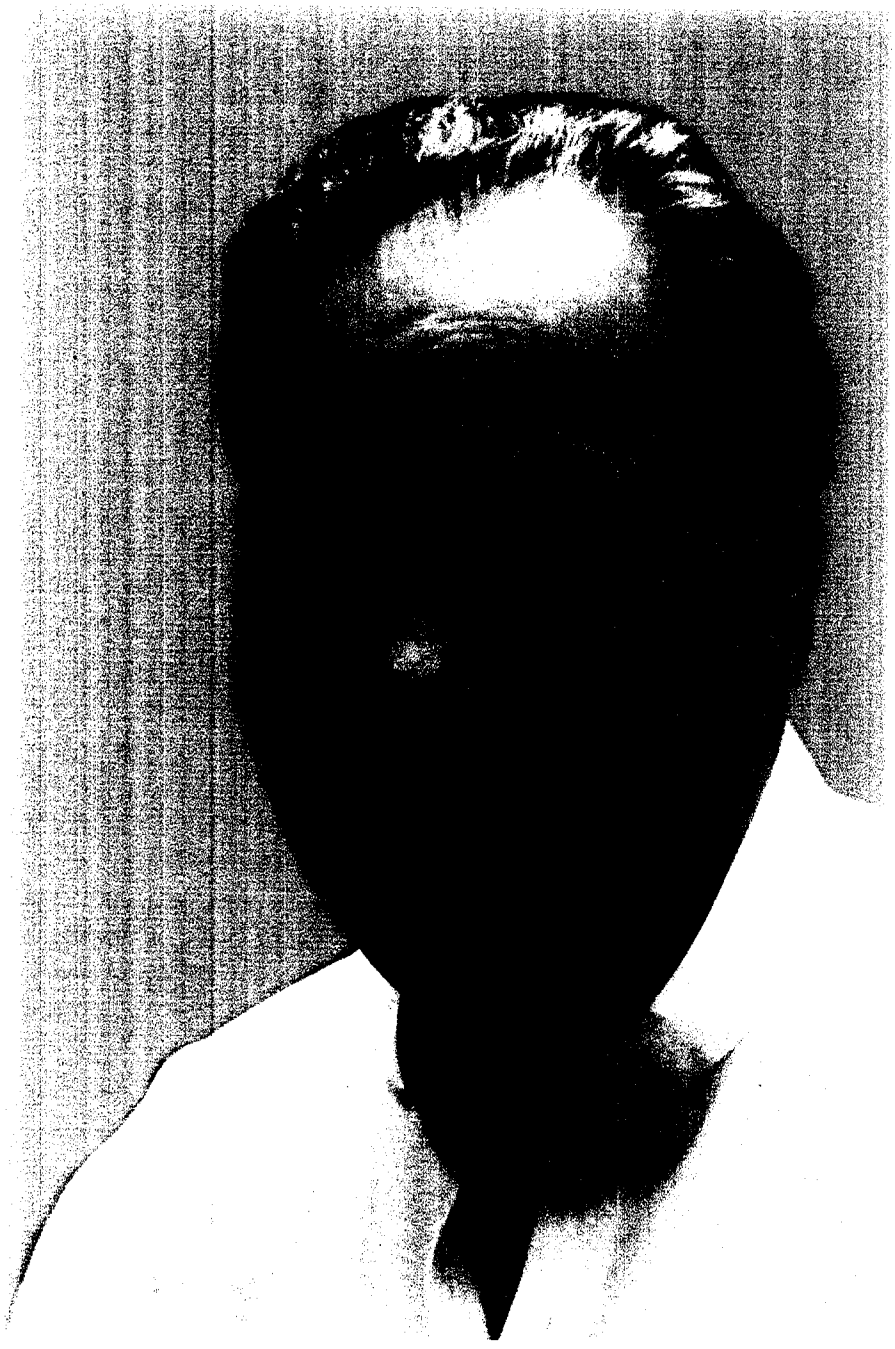

جاوید اقبال ایک تازہ تصویر اگست ۲۰۰۸ء

جاوید اقبال کے ڈرائنگ روم میں لگی ان کے بچپن کی تصویر کا عکس

جاوید اقبال انٹرویو دیتے ہوئے
دائیں طرف میز پر پڑی تصویر ان کی بہو کی ہے

جاوید اقبال کے صاحبزادے ولید اپنے بیٹے کے ساتھ

جاوید اقبال کے صاحبزادے ولید کی اہلیہ

یہ دونوں تصویریں انٹرویو کے دوران میں ان کی آمد پر کھینچی گئیں۔

شرکائے انٹرویو اگست ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر ریاض مجید ڈاکٹر جاوید اقبال ڈاکٹر انور محمد خالد

ڈاکٹر جاوید اقبال ثمینہ سلیم (مقالہ نگار)

ALLAMA IQBAL
Open University Library
(ACQ... SECTION)
113169
Date 29-08-09